سه ماهی

ابلاغ

مرتبین
سیده رضا
نسرین سروش

سیدہ حنا کا تحقیقی مقالہ

شاہ ولی اللہ کے صوفیانہ افکار

عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے

شاہ ولی اللہ کی ملی خدمات اور ان کے علمی کمالات کا روح پرور بیان ۔

زیر اہتمام :- **احمد سلمان پبلیکیشنز** ۱۸۴۲-T یوسف آباد
دلہ زاک روڈ ، پشاور ۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کی انعام یافتہ کتاب جسے صوبہ سرحد کے جانے پہچانے ادیب احمد پراچہ نے لکھا ہے

کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء

قیمت ۳۰ روپے

ایسی کتاب جس میں کوہاٹ کی آئندہ نسلوں کے لئے اپنے اسلاف کے چراغ روشن ہیں۔ کوہاٹ کے پہلے قلمکار سے موجودہ دور تک کے تمام اہل قلم کا بھرپور تعارف اور شعراء کرام کا منتخب نمونہ کلام شامل ہے، کوہاٹ کی علمی، ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور فکری سرگرمیوں پر مشتمل ایک اہم دستاویز، ادبی انجمنوں اور کوہاٹ سے نکلنے والے اخبارات کا عہد بہ عہد تذکرہ ۔

قومی اور نسلی حد بندیوں سے ماورا ہو کر سوچتا ہے اور ادب کے جزیروں کو باہم ملانے میں کوشاں ہے۔ شخصیت کی اس قسم کی وحدت بہت کم نقادوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ اس قسم کے نقادوں کے ہاں موضوع کے ساتھ نہ صرف ان کی تنقید کے پیمانے بدل جاتے ہیں بلکہ نظریاتی اساس بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالواسع کے ہاں یہ بکھراؤ پیدا نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنا ذاتی تشخص پیدا کیا ہے، مفاہیم کی سمت نمائی کی ہے، اپنی انفرادیت کی پہچان کرائی ہے، اور اس کی داد ڈاکٹر محمود الٰہی جیسے فاضل نقاد سے پائی ہے۔ میں اسے بڑی بات سمجھتا ہوں۔

ریشمی لہجے کے شاعر سہیل اختر کے فن اور شخصیت پر
ناموراہلِ قلم کے مقالوں کا خوبصورت مجموعہ

سہیل اختر

مہکتے جذبوں کا شاعر

دارالکتاب، ٹمپل روڈ، لاہور

سیدہ حنا کے افسانوں کا پہلا مجموعہ

پتھر کی نسل

سیدہ حنا کے ہر افسانے میں ذہانت کی چنگاریاں اُڑتی پھرتی ہیں۔ اِن کے افسانوں کے محسوسات فکر کے تعمق کا پتہ دیتے ہیں۔ اِن کے افسانوں کے بین السطور دانائی، بصیرت، خودآگہی اور آفاقی عرفان کے امکانات بھی نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل

نئی نسل کے نمائندہ شاعر
خاور اعجاز کا شعری مجموعہ

آنکھیں، رنگ اور خواب

"تلوار اُس کے ہاتھ"

محمد فیروز شاہ

شعر ہمارے تہذیبی شعور کا ورثہ ہے۔ یہ اور بات کہ ہم نے اپنی وراثتوں اور روایتوں سے قطع تعلق کر لیا ہُوا ہے۔ اب ہماری آنکھوں اور دلوں کو باہر سے درآمد شُدہ مناظر اچھے لگتے ہیں لیکن اس کے باوجود ابھی ہماری شعری ثقافت کے بین السطور اپنی تہذیبی اقدار سے محبّت کا رویّہ کہیں کہیں چمک اُٹھتا ہے۔ یہ چمک دمک شاعری کی کمک سے مالا مال ہو کر ایک نئے ادبی منظر کا سرنامہ بن جاتی ہے۔ عہدِ حاضر میں شاعری بچّوں کے ہاتھوں میں آئے ہُوئے معصوم مگر مظلوم کھلونے کی طرح بے بس ہو گئی ہے۔ شعر کی اپنی ایک قوّت ہوتی ہے۔ پُرانے زمانے میں لوگ اِس طاقت سے اپنی شمشیروں کو صیقل کرتے تھے لیکن اب یُوں لگتا ہے جیسے شاعری ایک لاچار اور بے کس مضمحل سی طاقت ہے جس پر طاقتور ہونے کا محض الزام ہی ہے۔ ویسے تو وہ خود مشقِ ستم بنی ہُوئی ہے۔ کبھی وہ دوسروں پر وار کرتی تھی اب خود جا و بے جا ملامتوں کا ہدف بنی ہُوئی ہے۔ اِس کُوئے ملامت میں قدم دھرنا اور اس اعتماد کے ساتھ کہ قرطاس کے اُجلے دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگنے دینا بجائے خود ایک اعزاز ہے۔ آج کے زمانے میں، میں صرف اُسے شاعر سمجھتا ہوں جس نے یہ اعزاز اپنے زورِ فن سے حاصل کیا، محض جھُوٹی گروہ بندیوں، کمزور بیساکھیوں اور نادان دوستوں کی داہ واہ کے زور و شور سے نہیں۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ گئے زمانوں کے آنگن میں "تلواروں کی جھنکار کے درمیان جوان مرد، نڈر اور شجاعت افروز جذبوں کی نئی فصلیں توانا جنگجو نسلوں کی پرورش کرتی تھیں۔ یُوں شعر جیسی نرم و نازک صنفِ ادب تیغوں کے سائے میں اپنی کائنات ہی آباد نہیں کرتی تھی بلکہ میدانِ جنگ میں تشکیل ہونے اور مٹنے والا ہر منظر مترنّم لفظوں کی گونج سے جنم لیتا تھا۔ نرم و نازک لبوں سے ادا ہوتے ہُوئے گیت لڑتی ہُوئی فوجوں کے حوصلوں کو ولولوں میں بدل دیتے تھے۔ یُوں شاعری بزم آرائی ہی نہیں رزم آرائی کا سامان بھی کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آج بھی خلوصِ فن اور دل کی لگن سے کہے ہُوئے شعر تاثیر کی وہی جاگیر رکھتے ہیں جو سچّے خوابوں کی تعبیر جیسی ہوتی ہے۔ اس لئے شاعری کو ایک ناقابلِ تسخیر قوّت اور گلاب کی سی نزاکت دونوں سرمائے بیک وقت حاصل ہیں۔ جہاں ایک طرف لبِ آبجُو رقص کرتے ہوئے ہوا کے دائرے، خنک پیڑوں کی شفیق بانہیں، شام کی شفقیں اور صبح کی صباحتیں کھلے، وسیع

بے کنار کھیتوں میں ہمکلام ہوتی ہوئی فطرت کے خوبصورت نظارے اور نیلے پانیوں کے سینے پر تھرکتی ہوئی نور کی کرنیں محبتوں کے استعارے بن کر زندگی کو دھنک رنگ بناتے ہیں وہاں دوسری طرف کائناتِ شعر تلوار کی کاٹ اور دلیر حرفوں کی رفاقت سے بھی آشنا ہوتی ہے۔

کلاسیک روایت میں شاید اسی لئے شعرائے کرام نے لبِ لعلین اور چشمِ سرمہ سا کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب کے نازک ہاتھوں میں تلوار کا ذکر بھی ضرور کیا ہے۔

اکبر حمیدی نے شعری وراثت سے اپنا رشتہ مضبوط کرتے ہوئے اپنی کتاب کا نام ہی "تلوار اُس کے ہاتھ" رکھا ہے۔

دلچسپ ہے بہت میرا اُس کا مقابلہ
تلوار اُس کے ہاتھ میرے ہاتھ میں سپر

اس مقابلے کے دور میں یوں لگتا ہے جیسے ہر انسان اپنے ہاتھ میں ڈھال اور دوسرے کے ہاتھ میں تلوار دیکھ رہا ہے۔ ویسے جب سے کربلا کا تاریخ ساز واقعہ ہوا ہے مظلوم ہونا معصوم ہونے کے معنوں میں آتا ہے۔ یہ الگ بات کہ نیزے پر سر اور ہونٹوں پر تلاوتِ حسین کے بعد کسی کو مفر نہیں ہوتی اور یہ ہو بھی کیسے سکتی ہے جبکہ ہم نے عمل کا وہ راستہ چھوڑ دیا ہے جو امام عالی مقام کے نقوشِ پا کو چومتا ہے۔ بہرکیف اکبر حمیدی کی شاعری مختلف الجہات معانی کی نئی نئی سمتوں میں سفر کرتی ہے۔ اپنے ضمیر کے خلاف کسی ماحول کو قبول نہ کرنے کا رویہ اُس کی شاعری میں نمایاں ہے۔ وہ مصلحتوں اور مصالحتوں کا اسیر نہیں ہوتا۔

میں نے تمہیں پھولوں کی طرح پالا ہوا ہے
کانٹو سے کبھی صلح نہ کرنا مرے بچو!

نئی نسل سے مکالمہ کا عمل اکبر حمیدی کی اس کتاب میں ایک من پسند خواب کی طرح بکھرا ہوا ملتا ہے۔

ہم اچھا وقت نہیں لا سکے نئی نسلو
مگر تمہارے لئے اچھے خواب لے آئے

خواب کی اپنی ایک آب و تاب ہوتی ہے۔ تعبیر خوبرو تتلیوں کی طرح ہاتھوں کے درمیان سے پھسل جاتے تب بھی اچھے خواب دیکھنا بجائے خود ایک تر و تازہ مسرت کا جوازہ ہے۔ زیست کی اس تپتی دھوپ میں زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں کی آرزو بھی ایک سہانے خواب کی جستجو ہی تو ہے۔

جلتے سورج پہ کسی زلف کا سایا رکھنا
اپنے خوابوں میں کوئی چاند کا ٹکڑا رکھنا

خود اعتمادی فنکار کا سرمایۂ جان ہے بے اعتماد لفظوں کا عفریت قلمکار کے اپنے فن کے لئے بہت بڑا

خطرہ ہوتا ہے۔ اکبر حمیدی خوش قسمت ہے کہ اُسے اعتماد کی دولت ملی ہے اور وہ اِس تلوار سے اُس خوف کا سر کاٹ دینا چاہتا ہے جس نے پورے قبیلے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے ۔۔

جو تیغ لٹکی ہے سر کاٹ کر نکل جائے
بلا سے جان چلی جائے ڈر نکل جائے

وہ اور ہوں گے جنہیں وقت شہر دے گا
جو ہم سے مانگنے والا ہے کیا ہمیں دے گا

شکست ہوگی اُسے فتحیاب ہم ہوں گے
وہ ٹوٹ جائے گا گُل سے گلاب ہم ہوں گے

کتاب کے پیش لفظ میں اکبر حمیدی نے فکری غلامی میں مبتلا ادب کے بیگانہ کیمپوں میں زندگی گزارنے والے اہلِ قلم سے اپنی مکمل لاتعلقی کا اعلان کیا ہے مجھے اُس کی اِس بات نے بہت شاد کیا ہے کہ ایک سچے شاعر کی ذات وطن اور کائنات مربوط فکری عناصر ہیں اور محبت، امن، آزادی، انصاف اور سچائی عظیم شاعری کی اساس ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جس دن اکبر حمیدی کی اپنی شاعری کی عمارت مکمل ہو جائے گی اور یہ عناصر اُس عمارت کے سنگِ بنیاد بن کر چمک اُٹھیں گے۔ اُس روز اکبر حمیدی کے ہاتھ میں صرف ڈھال ہی نہیں تلوار بھی آجائے گی کیونکہ تلوار صرف جارحیت ہی کی نہیں دفاع کی بھی علامت ہے ۔

دم بھر کو تازہ ہوا میں سانس لینے کی دیرانی خواہش سے اس میں جاگی
سُنو! میں تمہارے ساتھ جا رہی ہُوں
آج کی انارکلی کا دلگداز المیہ
تنہا اُداس لڑکی
سیدہ حنا کا لکھا ہُوا خوبصورت ناولٹ ۞ قیمت ۱۰ روپے

بشیر سیفی کا شعری مجموعہ "گفتار"

سید فیضی

ڈاکٹر بشیر سیفی کے پہلے شعری مجموعے "مطلع" کی اشاعت کے گیارہ سال بعد اُن کا دوسرا مجموعہ "گفتار" کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ "گفتار" کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر میں یہ کہوں کہ "مطلع" ان کے شعری سفر کے ابتدائی برسوں کی داستان ہے اور "گفتار" مابعد کے گیارہ برسوں کے شعری ارتقا اور فنی پختگی کے ساتھ ماحولی تاثرات اور پیش آمدہ تجربات کا نچوڑ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس دوران ان کی نگاہیں حقیقت بین ہو چکی ہیں جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

وہ جیتی جاگتی صورت ہے　　میں کیوں اس کو تصویر لکھوں

سیفی نے جس ماحول میں پرورش پائی، اُس نے سیفی کو یہ سوچنے پر ضرور مجبور کیا ہوگا کہ حقائق کو کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اسی ضمن میں نہ جانے کیا کیا سوالات اُن کے ذہن میں اُبھرے ہوں گے ؎

جواب ڈھونڈے گا کل زمانہ　　سوال ایسے اُٹھا رہا ہوں

حقیقت سے اغماض برتنے کا سوال بھی ایسا ہی ہے۔ سیفی نے اس سوال کا بخوبی ادراک کیا اور اپنے لئے وہ راستہ ڈھونڈا جو معاشی خارزاروں سے ہوتا ہوا انسان کو علم کی اعلیٰ منازل سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اس راہ میں چلتے ہوئے سیفی کو یقیناً چند ایک سخت مقامات سے بھی گزرنا پڑا لیکن عزم و استقلال اور تحصیلِ علم کی لگن کے ساتھ اُس نے یہ مقامات سر کر لئے۔ اللہ کی مدد شاملِ حال ہوئی اور وہ اپنے حالات و واقعات کی سُلگتی ہوئی بھٹی سے کُندن بن کر نکلا۔ اب وہ بشیر سیفی نہیں، ڈاکٹر بشیر سیفی تھا۔

وقت نے مجھ کو ہرایا بھی تو کیا
میں خود اپنے آپ سے ہارا نہیں

میں خود اپنی تکریم کروں
اتنی تو ہو توقیر مری

ملی ہے اب جو گیرائی منظر کی
کمائی ہے یہ میری عمر بھر کی

کامیابی ہو یا نہ ہو سیفیؔ
تم دقیقہ نہ کچھ اُٹھا رکھنا

اپنے زیاں کا دُکھ تو ہے لیکن خوشی بھی ہے
آخر کوئی تو صاحبِ کردار بھی رہا

میں جی رہا ہوں کہ اس کو مری ضرورت ہے
وہ جس کے نام تمنّا کا کوئی باب نہیں

"گفتار" میں سیفیؔ کے اندازِ فکر کو جو وسعتیں نصیب ہوئی ہیں وہ اس کی علو ہمتی اور علو خیالی کی آئینہ دار ہیں۔ "مطلع" میں بشیر سیفی نے زندگی کے چند گوشوں کی نقاب کشائی کی تھی۔ لیکن "گفتار" میں وہ کاروبارِ حیات کی ہر کشمکش کا عکاس نظر آتا ہے۔ گفتار زیادہ تر غزلوں، چند نظموں، جاپانی صنفِ سخن ہائیکو کے چند نمونوں اور متفرق اشعار کا ایسا نمونہ ہے جس میں سیفیؔ اپنی شخصیت اور فکر و فن کے تنوّع کے ساتھ پوری طرح نمایاں ہے۔ روایت سے جدیدیت تک اُس کا یہ شعری سفر گو زیادہ طویل نہیں لیکن اس میں جمالیاتی تحرّک اور عقلِ سلیم کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ایسا امتزاج جس نے خود اُس کی اپنی انفرادیت اور منفرد لہجے کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ فعّال شخصیتیں ماحول سے دب کر نہیں رہتیں بلکہ اُن کی فکری توانائیاں ماحول کو بدلنے اور نکھارنے میں سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔ بشیر سیفیؔ فطرتاً غزل کا شاعر ہے۔ پہلو میں ایک حسّاس دل رکھتا ہے۔ جذباتی صداقتوں کے اس آئینہ خانے میں جب اس کی تخلیقی آواز بلند ہوتی ہے تو وہ اثر سے خالی نہیں ہوتی۔ "گفتار" میں مطبوعہ غزلیات کے مطالعے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ سیفیؔ نے غزل کو نئے حسن، نئی تازگی اور نئے انداز سے نوازا ہے۔ ان میں عصری آگہی بھی ہے سماجی موضوعات کا احساس بھی اور مسائلِ حیات کا ادراک بھی۔ چھوٹی بحروں میں فطری جذبوں کی ترسیل اشاروں میں جو معنویت پیدا کرتی ہے، وہ نہ صرف گہرے تاثر بلکہ ایک نئے اسلوبیاتی مزاج کی صورت گر بھی ہے۔ سیفیؔ کے تغزّل کا خوبصورت انداز ملاحظہ ہو۔

بھید میرا کس طرح ظاہر ہوا
خامشی کی جب زباں کوئی نہیں

کتابِ ہستی کا تو مصنّف
فقط تمنّا کے باب میرے

چمک رہا ہے فقط اندھیرا　　چراغ سارے بجھے ہوئے ہیں

بسر ہوئی جو شمار کرتے　　وہ زندگی کس شمار میں ہے

چڑھاؤ پر ہے حیات نشہ　　کہ عمر کشتی اُتار میں ہے

اُس کو کوئی کیا سمجھاتے　　حرفِ آخر جس کی رائے
میری ناکامی کا باعث　　خود میرے اوہام کے سائے
میری شہرت کے کیا کہنے　　مجھ سے ناواقف ہمسائے

میں تیری دید کی معراج پر ٹھہر جاؤں　　کہ اس مقام تحیّر سے بھی گزر جاؤں
ہیں سر بُریدہ حقائق مرے تعاقب میں　　میں دشتِ خواب سے نکلوں اگر تو مر جاؤں
عجب نہیں کہ مرا نام تو بھی لے نہ سکے　　کسے خبر ہے زمانے سے میں بھی ڈر جاؤں

روشن تیرگی کا عکس، پہچان کا مژدہ، ایک نظم۔ سب کے لئے، اندیشہ، راہرو، میری آنکھیں، خواب بھرے زندگی، اور خزاں، ۔ بشیر سیفی کی چند آزاد نظمیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان میں وہ اپنی ذات کو کائنات سے ہم آہنگ کر کے مظاہرِ فطرت کی تصویر کشی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح یہ نظمیں اُمید اور رجائیت کی علامتیں بن کر اُسے زندگی کا سفر جاری رکھنے کا نیا حوصلہ اور نیا ولولہ عطا کرتی ہیں۔ مثلاً، ایک نظم "سب کے لئے" کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

اے مرے دوستو
تم مگر میرے نقشِ قدم سے پرے
قسمتوں کے بھنور سے ہو لپٹے ہوئے

اور میں
آخری سانس تک
زندگی کے تضادوں سے لڑتا رہوں گا۔
بجھوں گا
مگر روشنی کی طرح

جہاں تک ہائیکو نگاری کا تعلق ہے یہ درآمدہ صنفِ سخن ہے اور اس سے ہماری اصناف سخن میں ایک اضافہ تو ضرور ہوا ہے لیکن اس اضافے کی برقراری کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ ہمارے بعض نوجوان شاعر جو تجربے کے طور پر اس صنف کو اُردو کے تہذیبی مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اُن میں بشیر سیفی کا نام بھی شامل ہے۔ رگفتار، میں مطبوعہ ہائیکو کے نمونوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سیفی نے ہائیکو کہتے ہوئے اُن تمام عناصر کو یکجا کر دیا ہے جنہیں داخلیت، جذبے کی شدت اور خود اظہاریت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اُردو شاعری میں اب تک جو اس کی پذیرائی ہوئی ہے، ہو سکتا ہے وہ اس کے روشن مستقبل کی دلیل بن جائے۔ بشیر سیفی کی ہائیکو نگاری کا انداز ملاحظہ ہو۔

ایک ہی سلسلہ سفر کا ہے
منزلوں میں بھی اختلاف نہیں
راستے کیوں جدا جدا ٹھہرے!

باغ کی حد عبور کرنے سے
کون خوشبو کو روک سکتا ہے

بات سچی نکل ہی جاتی ہے
شاخ شاخ کٹ جائے
پیڑ تو سلامت ہے
پھر بہار آئے گی

رگفتار، کے آخری چار صفحات بشیر سیفی کے متفرق اشعار پر مشتمل ہیں جن سے اُس کا مخصوص لہجہ اور منفرد رنگ و آہنگ پوری طرح نمایاں ہے اور طرزِ احساس میں زیرِ سطح ایک نئی سی لہر بل کھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن سیفی یہ چاہتا ہے کہ اس کا علم کسی کو نہ ہو ؎

کیا ہو رہا ہے، اس پہ کوئی تبصرہ نہ کر
سیفی خموش رہنے میں تیری نجات ہے

ساغر صدیقی

قرۃ العین طاہرہ

ساغر صدیقی ان چند لکھنے والوں میں سے ہے، جن کی شخصیت متنازعہ فیہ رہی ہے۔ میراجی، فرید جاوید، منٹو اور ساغر، یہ وہ تخلیق کار ہیں کہ جنہیں زندگی نے اپنے تمام رنگ اور تمام جلوے دکھائے ہیں۔ ان کی زندگی ایک ہموار راستے پر کبھی گامزن نہ ہوئی۔ نشیب و فراز، جذب و جنوں، عشق و مستی، فقر و استغنا، محبت و نفرت، سبھی جذبوں اور سبھی موسموں سے وہ گزرے ہیں۔

ساغر صدیقی کے متعلق ایک سطحی سا خیال یہ ہے کہ ایک شاعر جو نشے میں چور، اپنی ذات اور اپنے ماحول سے بے نیاز، فرشِ خاک پر مدہوش پڑا ہے۔ مجھے اس رائے سے کسی قدر اختلاف ہے۔ بے شک اس کی زندگی کا بیشتر حصہ خاک پر بسر ہوا۔ درگاہوں، فٹ پاتھوں، سراؤں اور مختلف کوٹھڑیوں میں اس نے دن بتائے۔ لیکن وہ عقل و خرد سے بیگانہ نہیں تھا۔ اُسے اپنی حالت اور اپنے حالات کا مکمل شعور تھا۔ ایک ایسا شخص جسے اپنے معاشرے اور اپنے احباب سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ بے حس کہلائے گا یا عقل و شعور سے بے گانہ۔ ساغر اِن خصوصیات سے مبرّا تھا۔ اس کی میلی ردا، ننگے پاؤں اور بوسیدہ لباس اُسے شرفا اور پڑھے لکھے طبقے میں مشکوک بنا دیتا ہے۔ لیکن وہ ایسا صاحبِ شعور تھا کہ جس نے معاشرے کے اُن زخموں کی نشاندہی کی۔ ان ناسوروں کو چھیڑا جن پر دوسرے شعرا نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان میں اور ساغر میں وہی فرق ہے جو مشاہدے اور تجربے میں ہوتا ہے۔

اس کی شاعری کا سرسری مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ روایتی شاعری، روایتی الفاظ و تراکیب تشبیہ و استعارے مستعمل ہیں۔ اتنی کرخت اور سخت زندگی گزارنے والے شاعر کی تخلیقات میں کہیں بھی فٹ پاتھ، رکشہ، تانگہ، ٹرک، ریل گاڑی، سٹیشن، جیسے الفاظ نظر نہیں آتے۔ جبکہ جدید غزل کی ڈکشن میں یہ تمام الفاظ اپنی تمام تر کرختگی کے ساتھ موجود ہیں۔ ساغر کے نزدیک دلی کیفیات کا بیان اور ذاتی تجربوں کی روداد بے ترتیب اور کرخت الفاظ کی بدولت اپنی تاثیر کھو بیٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں الفاظ کی لطافت اور نغمگی کا عنصر غزل کے مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی شعری لغت میں نرم مدہم خوبصورت پھولوں کی مانند دھیمے الفاظ کا استعمال

ہے۔ چاند اور چاندنی، گل و بہار، جادۂ منزل، گیسو و رخسار، مے و میخانہ، ساقی و بادہ، اسیرِ دام، قفس اور آشیاں جیسے خوبصورت الفاظ ملتے ہیں، جن پر ہماری روایتی شاعری کی مضبوط و مستحکم عمارت کھڑی ہے۔ لیکن نئے تناظر میں، اپنے عہد کی تمام تر معنویت اپنے اندر سموئے ہوتے، یہ لفظ اتنی چابکدستی اور ہنرمندی سے اپنی جگہ موزوں ہیں کہ کوئی دوسرا لفظ ان کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نغمگی اس کی غزلوں کی ایک خاص صفت ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاعری کی ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ جو بخوبی گائی جا سکے۔ تو ساغر کی غزلیں اس تعریف پر بھی پوری اترتی ہیں۔ غزل طویل بحر میں ہو یا مختصر، نغمگی و لطافت کا پہلو کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ؎

کبھی تو آؤ، کبھی تو بیٹھو، کبھی تو دیکھو، کبھی تو پوچھو
تمہاری بستی میں ہم فقیروں کا حال کیوں سوگوار سا ہے

؎ میں نے پلکوں سے دریار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں، جسے کوئی صدا یاد نہیں

ساغر نے سماج کی بدلتی اقدار کو صرف دیکھا ہی نہیں برتا بھی ہے۔ اس پر جذب و جنوں، فنا فی العشق اور عقل و شعور کے سبھی دور گزرے ہیں۔ ایک طرف تو وہ اس انسان سے محبت کرتا ہے جو زندگی اور معاشرے کا حصہ ہے۔ دوسری طرف وہ انسانی فطرت کے اس حصے سے بھی پیار کرتا ہے جو سماج سے کٹا ہوا ہے۔ کیونکہ بے تعلقی اور احساسِ تنہائی کے بغیر زندگی کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ گھر کی خواہش یا بے گھری کا دکھ، اس کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ محلوں اور مکانوں سے انسان کے رشتے کے تعین کا قائل نہیں۔ سچی اور کھری شخصیت، خواہ وہ بند گلیوں میں ہو یا عالی شان مکانوں میں، اپنا آپ منوا لیتی ہے اس نے اپنی ذات کو کبھی ارزاں نہیں جانا۔ اسے اتنی پستی میں نہیں دھکیلا کہ لوگ روندتے ہوئے گزر جائیں۔ ایسی حالت میں جب لوگ اسے دیکھ کر نفرت سے یا اس خوف سے کہ کہیں ہمیں مروت میں اس کی مدد نہ کرنی پڑ جائے، راستہ بدل لیا کرتے تھے۔ ساغر تمام تر لاتعلقی کے باوجود اس بے رخی کو شدت سے محسوس کیا کرتا تھا۔ شکوہ و شکایت سے گریزاں کی سرشت میں تھا، لیکن آخر کب تک، وہ دوستوں سے معاشرے سے اور ان سب کے خالق سے شکوہ کناں ہوتا ہے۔ ؎

دکھ درد کی سوغات ہے دنیا تری کیا ہے
اشکوں بھری برسات ہے دنیا تری کیا ہے

شکوہ و شکایت کے اس باب میں وہ اپنی ذات کی نفی کہیں نہیں کرتا۔ اسے اس بات کا اندازہ ہے کہ اجلے لباس اور صحت مند جسموں کے اندر وہ دل و دماغ نہیں جو قدرت نے اسے عطا کیا ہے۔ اس کی شاعری دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا تھا، یا حالات نے اسے کیا بنا دیا تھا۔ لیکن اس کے باطن کے سچے جذبوں اور ولولوں نے اس کے خیالات کو وہ سرفرازی و دلیعت کی کہ وہ اتنے یقین کے ساتھ اپنی ذات اور اپنے افکار کو دوسروں سے اہم جانتا تھا۔ ؎

عید مبارک

سہ ماہی

ابلاغ

پشاور

مرتبین

سیدہ حنا

نسرین سروش

معاون مدیر

حامد سروش

پشاور

قیمت

اندرونِ ملک

۱۵/= روپے

شمارہ

اپریل

۸۹ء

قیمت :

بیرونِ ملک

ایک ڈالر

احمد سلمان پبلیکیشنز

T-۱۸۴۲ یوسف آباد

دلہ زاک روڈ، پشاور

ایڈیٹر و پبلشر : سیدہ حنا   پرنٹرز :۔ اورکزئی پرنٹرز   مقامِ اشاعت :۔ پشاور

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ہم بنائیں گے یہاں ساغرؔ نئی تصویرِ شوق
ہم تخیل کے مجدد، ہم تصور کے امام

ساغرؔ کی تشبیہیں، استعارے، علامتیں، واقعات و کردار بیشتر مے و میکدہ سے متعلق ہیں۔ شاید یہ اس وجہ سے ہے کہ انسان جب اس دُنیا کو، اس معاشرے کو، اپنے ماحول اور افراد کو اُس طورِ زیست بسر کرتے ہُوئے نہیں دیکھتا، جیسی کہ اس کی خواہش ہے، تو وہ تمام دنیا کو بدل دینا چاہتا ہے۔ وہ ایک ایسی یوٹوپیا تخلیق کرنا چاہتا ہے، جہاں محبت ہو، نفرت نہ ہو، سچائی ہو جھوٹ نہ ہو، لیکن ایسا ہو نہیں پاتا، کہ جدید معاشرے کی اوّلین صفت منافقت ہے۔ اور اس منافقت کے بطن سے جھوٹ، کینہ، نفرت، حسد و ریاکاری نے جنم لیا ہے۔ تو جب وہ منافقوں کے اس دور میں محبتوں کی دھنک پر اندھیرے پھیلتے دیکھتا ہے تو اپنے مشن میں ناکام ہو کر دنیا سے الگ تھلگ ہو بیٹھتا ہے۔ تنہائی اُسے اور زیادہ سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور جب یہ سوچیں اُسے کوئی مثبت راستہ دکھانے کے بجائے اپنی زہریلی زبانوں سے چاٹنے لگتی ہیں تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی، اس دُنیا سے جس نے اُسے تنہائی کے دوزخ میں بھڑکتے شعلوں کے درمیان دھکیلا ہے۔ خود کو پُرسکون کرنے کے لئے بے حسی طاری کر لے۔ ایک حساس انسان کے لئے بے حس بننا آسان نہیں۔ اس کے لئے اُسے وہ ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں، جو دوسروں کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ مے و میکدہ ہی اُسے سکون بخشتے ہیں۔ لوگوں کے نزدیک یہ بے حسی اور بے ہوشی کا دور ہے۔ لیکن ساغرؔ کے خیال میں اسی روشنی سے دلوں کے اور دنیا کے اندھیرے دُور ہو کر افکار کو نئی راہ سمجھاتے ہیں۔ ؎

ایسی تجلیاں ہیں کہاں آفتاب میں
انوارِ خاص ہیں مرے جامِ شراب میں

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں — وہ روشنی سی پلا دو بڑا اندھیرا ہے

"خود اعتمادی" شخصیت کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ساغرؔ کی شاعری میں اس کی جا بجا جھلک ملتی ہے ساغرؔ بادی النظر میں ایک تنہا، محروم اور مجروح شخص لیکن جس کے ولولے اور جوش، جس کے خیالات و افکار میں اتنی تندی و تیزی کہ وہ تمام دنیا کا مزاج بدلنے پر تیار ہے۔ کاروبارِ دنیا کے نظام کو بدل دینے کا تیقن اور بات کو فیصلہ کُن انداز میں کہنے کا ڈھنگ ساغرؔ کی شاعری کا اہم حصہ ہے۔ ؎

یقیں کر کہ یہ کہنہ نظام بدلے گا — مرا شعور مزاجِ عوام بدلے گا

ساغرؔ کی شاعری کے حوالے سے ایک بات اور میرے ذہن میں آئی کہ آج کی غزل میں جن چند موضوعات کو اہمیت دی جا رہی ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہمیں خلاف لکھنا ہے، حکومت کے، سیاست کے، سماجی و معاشرتی نظام کے، اُمراء کے، استحصالی قوتوں کے، طبقاتی نظام کے۔ ایسی شاعری میں کہیں شاعر احتجاجی رویے اختیار کرتا نظر آتا ہے، تو

کہیں مصالحت۔ یہ کیسی شاعری اور کیسا احتجاج ہے جو وہ اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سی کی ٹھنڈک میں دُنیا جہاں کے فن کے شہ پاروں کے درمیان بیٹھ کر (بقول مجنوں گورکھپوری۔ ان کے ڈرائنگ روم اتنے پُر آسائش ہیں کہ جہاں ایک عام انسان کو اپنا دم گھٹا ہُوا محسوس ہوتا ہے") وہ دُنیا کے سرد گرم موسموں، بھوک، افلاس، بیماری اور بے گھری کے دُکھ کو بڑے خوبصورت لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ نظامِ حکومت کو بدلنے اور بساطِ سیاست کو اُلٹنے کے درپے ہے۔ لیکن کیا خود کبھی اس نے خاک میں لتھڑے ہوتے اور پیپ میں نہلائے ہُوئے جسموں پر اپنے جسموں کا گمان بھی سہی، کیا ہے۔ ساغرؔ ان روز و شب سے، ان آزاروں سے خود گزرتا رہا ہے اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ ؎

ہر شے ہے پُر ملال بڑی تیز دُھوپ ہے ہر لب پہ ہے سوال بڑی تیز دُھوپ ہے

تو یہ دُھوپ صرف استعاراتی دُھوپ ہی نہیں بلکہ جلتی کڑکتی وہ دُھوپ ہے کہ جب پرندے بھی گھونسلوں میں پناہ لیتے ہیں تو وہ انسان جسے سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں وہ دُھوپ کی تمام سختی اور تیزی اپنے جسم و جان پر ہی جھیلے گا۔ زمانے کی تمام سختیوں اور تکلیفوں کے باعث کیا وہ یہ خواہش نہیں کرے گا کہ اُسے بھی اِن سے بچاؤ کا حق ہے جیسا کہ دوسرے افراد کو حاصل ہے کہ تزئینِ گلستان میں اس نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ وطن کی مٹی کے لئے اس نے بھی اپنے خُون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کا عہد کیا ہے۔ تو پھر وہ اس کی بہتری کے لئے کیوں نہیں کچھ کہہ سکتا، سُن سکتا۔ ؎

ہاں! میں نے لہُو اپنا گلستاں کو دیا ہے
مجھ کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے

اور وہ حق کچھ زیادہ تو نہیں مانگتا۔ ؎

کوئی حقیر سی شے ڈال میرے ساغر میں کہ زندگی کو برائے عوام کرنا ہے

جب وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے معاشرے پر، ظلم و استبداد پر، قتل و خوں ریزی پر اور کذب و ریا پر تنقید کا حق حاصل ہے تو کیا وہ اس حق کو پوری آزادی کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا ہماری سوچ آزاد ہے۔ ہم اپنی مرضی سے سب کچھ سوچ سکتے ہیں۔ کیا ہمارے دل و دماغ پر ہمارے روایتی و قدیم تعصبات کا اثر تو نہیں۔ ہمارے نظامِ تعلیم نے ہمیں نئے افکار دینے کے بجائے تقلیدی ذہن تو نہیں دیا۔ ماحول نے ہمارے اندر اٹھتے ہوئے خیالات پر اپنا گہرا اثر تو نہیں چھوڑا۔ کیونکہ جب تک ہم آزادی سے سوچ نہیں سکیں گے، کہہ بھی نہیں سکیں گے۔ ساغرؔ حرص کی دُنیا سے دُور تھا۔ اُسے اپنی کسی چیز کے چھن جانے کا خوف بھی نہ تھا۔ اُس نے اس نظامِ حیات پر احتجاج کیا ہے۔ احتجاج کے بھی دو انداز ہیں۔ ایک تو یہ کہ بغاوت و انقلاب، شکست و ریخت اور نعرہ بازی کا انداز، اور دوسرا پُر جوش لیکن تعمیری، دردآمیز اور محبت بھرا۔ تو ساغرؔ جو کچھ بھی کہتا ہے، ایک دم انقلابی و باغیانہ ذہنیت

کے ساتھ نہیں، بلکہ سلطانِ وقت کو کچھ سمجھاتے ہوئے اُسے تنبیہہ کرتا ہے کہ وہ اپنی روش بدل ڈالے، کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں حالات خود اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ ؎

جس عہد میں لُٹ جائے فقیروں کی کمائی — اُس عہد کے سلطاں سے بڑی بھول ہوئی ہے
؎ جنہیں خدا کی طرح بولنے کی عادت ہے — انہیں زبانِ بشر میں کلام کرنا ہے

لیکن کب تک وہ اس دھیمے اور نرم لہجے میں اپنے لئے اور دوسروں کے لئے جینے کا حق مانگتا رہے گا۔ ایسا بھی وقت آتا ہے جب وہ تقدیر سے، زمانے سے، دستورِ جہاں سے اور ان دستوروں کو نافذ کرنے والے فرمانرواؤں سے احتجاج کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے لہجے میں تلخی اور شکوہ نمایاں ہو جاتا ہے جس سے وہ بچنا چاہتا ہے۔ ؎

دستورِ جہاں بھی گونگے ہیں، فرمان یہاں بھی بدلے ہیں
اے دوست خدا کا نام نہ لے، ایمان یہاں بھی اندھے ہیں

شکوہ لب پر آ ہی جاتا ہے۔ ورنہ ساحرؔ ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ؎

زمانے کو نہ دے الزام، اے ناواقفِ منزل
زمانے کی نظر ہم ہیں زمانے کا چلن ہم ہیں

اور یہ بڑی بات ہے کہ آج ہم اخلاقی، سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی طور پر جس تیزی سے تنزلی کا شکار ہیں اس کا الزام کبھی اپنے سر نہیں لیتے۔ "ماحول ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے، معاشرہ ہی سارا تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ اخلاقی اقدار کا بیڑا غرق ہو گیا ہے"، یہ جملے ہم دن میں متعدد مرتبہ بولتے اور سنتے ہیں۔ لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اس معاشرے اور ماحول کو بنانے والا اور بگاڑنے والا کون ہے۔ خود فرد، جو ایک بُرائی یا ایک اچھائی کرتے ہوئے یہی سوچتا ہے کہ کیا فرق پڑے گا۔ اگر میں نے سچ یا جھوٹ بول دیا۔ اتنے بڑے معاشرے کہ میری نیکی یا بدی کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ پہلا قدم اُٹھانا ہی مشکل ہے۔ اگر ایک کے بعد ایک بُرائی کرتا ہی چلا جائے تو بُرائی اتنی پھیل جائے گی کہ پھر بُرائی کا احساس ہی ختم ہو جائے گا۔ اور وہ ایک عام بات ہو کر رہ جائے گی۔ اسی طرح ہم اچھائیوں کو بھی تو فروغ دے سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ پھر وہی سامنے آتا ہے کہ جو صاحبِ کردار ہیں ان کے دل خالی ہیں۔ اور وہ ؎

جن کے دامن میں کچھ نہیں ہوتا
ان کے سینوں میں پیار دیکھا ہے

اور کیا یہی تہی دامانی دنیا کی سب سے بڑی دولت نہیں ہے؟

اندھیری رات کا تنہا مسافر / ایک مطالعہ

رعنا اقبال

شہزاد منظر ایک معروف صحافی اور ادیب ہیں۔ اب تک ان کی تین کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن میں سے دو "جدید اردو افسانہ" اور "ردِ عمل" تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ اور ایک ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" اندھیری رات کا تنہا مسافر ان کا پہلا اور اب تک واحد ناول ہے۔ اس سے پہلے وہ افسانے اور ناول کے ایک کثیر المطالعہ اور پُرجوش ناقد کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے کچھ افسانے بھی وقتاً فوقتاً رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

شہزاد منظر اس لحاظ سے پروفیسر محمد حسن عسکری سے قریب معلوم ہوتے ہیں کہ وہ بھی پروفیسر عسکری کی طرح ناول کو ایک بڑی اور بھرپور صنف سمجھتے ہیں۔

اپنی منکسر المزاجی کے باوجود شہزاد منظر نے اپنے ناول کے بارے میں لکھا ہے۔

"۱۹۸۰ء کا عشرہ اردو ناول کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس عشرے میں اردو ناول کا احیا ہوا ہے اور چند بہت اچھے اور قابلِ ذکر ناول لکھے گئے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میرا ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" بھی انہی بہت اچھے اور قابلِ ذکر ناولوں میں سے ہے۔ لیکن میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جس موضوع پر اور جس پسِ منظر میں ناول لکھا ہے وہ قطعی مختلف اور انوکھا ہے۔"

اس بات سے قطع نظر کہ شہزاد منظر کا ناول کس قدر مختلف اور انوکھا ہے۔ ہم پہلے اس کے انتساب کی طرف توجہ کرتے ہیں کیونکہ اس کا تعلق ناول سے بہت گہرا ہے۔

مصنف نے اپنے ناول کو گبریلا مسترل سے ان الفاظ میں معنون کیا ہے۔

"گبریلا مسترل (GABRIELA MISTRAL) کے نام جس کی زندگی سے متاثر ہو کر میں نے یہ ناول لکھا"

اس کے علاوہ "کچھ اس ناول کے بارے میں" کے عنوان کے تحت بھی مصنف نے لکھا ہے۔ "ناول کا موضوع مجھے اپنی زبان کی شاعرہ گبریلا مسترل کی زندگی سے ملا۔

یہاں گیبریلا مسترل کے بارے میں تھوڑا سا جان لینا بہتر ہوگا۔

گیبریلا مسترل جنوبی امریکہ کی ریاست چلی کی رہنے والی تھی۔ وہ اسپینی زبان کی ایک ایسی شاعرہ تھی جس نے اپنی شاعری کی بنا پر آج سے تقریباً پینسٹھ سال قبل ادب کا نوبل انعام حاصل کیا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک اسکول مسٹریس تھی۔ اس نے عمر بھر چھوٹے بچوں کو درس دیا اور اپنی زندگی درس و تدریس کے لئے وقف کر دی۔ اس نے نوجوانی میں ایک انجن ڈرائیور سے محبت کی۔ اس نے بھی محبت کا جواب محبت سے ہی دیا لیکن شادی کرنے سے انکار کرتا رہا۔ مسترل کے اصرار پر وہ اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ لیکن شادی سے ایک روز قبل خودکشی کر لی خودکشی کی وجہ فریضۂ زوجیت کی ادائیگی سے اس کی معذوری تھی۔ اس سانحہ کا گیبریلا مسترل کو اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے عمر بھر شادی نہیں کی اور ساری زندگی یونہی گزار دی۔

ناول کا پیش لفظ معروف و ممتاز افسانہ نگار رام لعل کا تحریر کردہ ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ "ناول کا اصل کردار شبنم ہے۔"

لیکن اس کے باوجود اس ناول سے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اصل اور بنیادی کردار کون ہے — شبنم یا انور — ؟ کیونکہ ناول کا عنوان خود مصنف نے "اندھیری رات کا تنہا مسافر" تجویز کیا ہے۔ جس سے ذہن کسی نسوانی کردار کی بجائے مرد کردار کی طرف جاتا ہے۔ اس طرح کا سوال پہلے بھی بعض ڈراموں اور ناولوں کے بارے میں کیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً شیکسپیئر کے ڈرامے "جولیس سیزر" اور امتیاز علی تاج کے ڈرامے "انار کلی" سے متعلق بھی یہ بحث اب تک موجود ہے۔

مذکورہ ناول میں سب سے پہلی بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خود مصنف نے شبنم کو مرکزی کردار ظاہر کیا ہے جبکہ ہمارے خیال میں ناول کا اصل کردار انور ہے۔ اس کی کچھ وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ شبنم پہلے ہی سے ایک شادی شدہ عورت ہے جو کچھ عرصے بعد بیوہ ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ایک عملی زندگی گزار چکی ہے اور بیوی کی حیثیت سے اس نے ایک مرد کی قربت حاصل کی ہے اس کے بعد جب وہ بیوہ ہو جاتی ہے تو بھی تمام رنگینیوں اور سماجی سرگرمیوں کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہی ہے اس لئے بہت زیادہ ہمدردی کی وہ قطعاً مستحق نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس انور جو شبنم سے پہلے کسی اور سے محبت بھی نہیں کر سکا تھا۔ شبنم کے شادی پر بہت زیادہ اصرار کے بعد اپنی ذاتی مجبوریوں کی بنا پر خودکشی کر لیتا ہے۔ یہاں کوئی بھی حساس قاری اپنے دل میں انور کے لئے زیادہ ہمدردی اور تاسف محسوس کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شبنم بیوہ ہو جانے کے باوجود خود کو بہت بناسنوار کر رکھتی ہے اور بسا اوقات اس کا لباس دوسروں کو اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شبنم کے طرزِ آرائش سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ اب بھی

دوسروں کی نظروں کا مرکز بنی رہنا چاہتی ہے اور یہ بات مشرقی معاشرے میں قابلِ اعتراض سمجھی جاتی ہے۔

یہاں مصنف کا خیال یہ ہو سکتا ہے کہ شبنم جس ماحول میں رہتی ہے وہاں ان باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ بلکہ جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق شبنم خود کو ٹپ ٹاپ سے رکھتی ہے۔

اس کے لئے ہمارا جواب یہ ہو گا کہ اگر وہ لندن کے ماحول کی وجہ سے خود کو اس طرح رکھتی ہے تو پھر اُسے یہ چاہیے کہ وہ وہاں کے ماحول کے مطابق جینز، اسکرٹ اور دیگر وہی چیزیں استعمال کرے جو وہاں کی خواتین کرتی ہیں۔ کھنکتی چوڑیاں، پھسلتی ساڑھیاں اور دیگر لوازماتِ آرائش تو مشرق کی سہاگنوں کا خاصا ہیں، بیواؤں یا مغربی خواتین کا نہیں۔

جہاں تک ناول کے ہیرو انور کا تعلق ہے تو وہ شوہر کا ہم شکل ہونے کی وجہ سے شبنم کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ شبنم اس سے محبت ہی کر بیٹھتی اور مزید یہ کہ شادی کرنے کو بھی تیار ہو جاتی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ شدید حیرت کا شکار ہو جاتی۔ پھر اگر فطری تقاضے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شادی کو درست سمجھ بھی لیا جاتے تو بھی یہ پہلو زیادہ افسوسناک نظر آتا ہے کہ انور شبنم سے بے تحاشا محبت کرنے کے باوجود (واضح رہے کہ یہ اس کی پہلی محبت ہے) شادی کرنے سے ہچکچاتا ہے اور جب شادی کے لئے شبنم کا اصرار بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے تو وہ ہامی بھرنے کے باوجود خودکشی کر لیتا ہے اور نہ صرف اس خوشی سے محروم رہ جاتا ہے جو اپنی محبت کو پا لینے سے حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ اپنی جان سے بھی جاتا ہے۔

مصنف اس کردار کو صرف اس وجہ سے ثانوی حیثیت نہیں دے سکتے کہ یہ کردار کہانی میں بعد میں آیا ہے۔ اور شبنم شروع سے اس کہانی میں موجود ہے۔ یہ کردار بعد میں آنے کے باوجود سب پر چھا گیا ہے اور جو اہمیت اس کی شروع میں قائم ہوئی تھی وہ آخر تک باقی رہتی ہے بلکہ لوگوں کے ذہنوں پر جو بات نقش ہوتی ہے وہ انور کی موت ہی ہے۔

ایک جگہ مصنف لکھتے ہیں:۔

"یہ ناول اسپینی شاعرہ گیبریلا مسترل کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے لیکن ناول کا مسترل سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے سوائے ناول کے مرکزی خیال کے"۔

اگر مصنف گیبریلا سے بہت زیادہ متاثر ہی تھے جو کہ غلط بھی نہیں ہے تو پھر وہ اپنے ناول کی ہیروئن کو بالکل اسی انداز میں رکھتے جس طرح گیبریلا رہتی تھی اور آخر تک رہی۔ یعنی اپنی بچھڑی ہوئی محبت اور ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانے والے محبوب کے صدمے کی وجہ سے اس نے اپنی زندگی کس طرح گذاری ہو گی۔ اس کا تصور بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ اگر ناول کی ہیروئن بھی بالکل وہی انداز اختیار کرتی تو یقیناً وہ ناول کا مرکزی کردار رہتی اور شروع سے آخر تک اسی کے گرد کہانی گھومتی۔ لیکن بالفرض محال اگر مصنف اور پھر رام لعل کی بات کو درست مان بھی لیا جائے تو

ناول کا نام یعنی "اندھیری رات کا تنہا مسافر" گمراہ کن ثابت ہوتا ہے۔ نام دیکھنے کے بعد پہلے ہی لمحے میں جو خیال قاری کے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کسی مرد یا لڑکے کی کہانی ہے۔ جبکہ مصنف کے اپنے الفاظ میں، "گبیریلا اس کا موضوع ہے"۔ تو کیا مصنف نے نام رکھنے میں غلطی نہیں کی؟ دراصل مصنف نے اپنی سادگی کی بنا پر اس نکتے پر شاید غور نہیں کیا۔

شہزاد منظر نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"یہ ناول ۱۹۶۲ء میں پہلی بار ماہنامہ "نگارش" کراچی کے سالنامے میں "زندگی ایک نغمہ" کے عنوان سے شائع ہوا"۔ ناول کے مواد کو دیکھتے ہوئے یہ نام بھی کسی طرح مناسب نہیں لگتا۔ کیونکہ ناول ابتداء سے انتہا تک ٹریجڈی ہے اور یہ نام کسی طربیئے کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ بہر حال مرکزی کردار کے تعین میں یہ غلطی کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوتی ہے۔ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ مثلاً اردو کے مشہور اور نہایت کامیاب ڈرامے "انار کلی" میں اس بات کا تعین نہیں ہو سکا کہ مرکزی کردار اکبر ہے یا سلیم اور ٹریجڈی ان دونوں میں سے کس کے ساتھ ہوتی۔ اس طرح جولیس سیزر میں بھی مرکزی کردار کا تعین نہیں ہو سکا کیونکہ جولیس ابتداء میں ہی مر جاتا ہے اور ساری کہانی اس کے مرنے کے بعد چلتی ہے۔

اب ایک دوسری بات اور وہ یہ کہ ناول کا پس منظر مصنف کے اپنے الفاظ میں:

"ناول کا موضوع ایسا ہے جس کے واقعات صرف آزاد معاشرے میں ہی رونما ہو سکتے ہیں۔ ہمارے "پابند معاشرے" میں نہیں۔ موضوع کا تقاضا تھا کہ میں ایک ایسے پس منظر کا انتخاب کروں جہاں میرے کردار آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ میں نے لندن کبھی نہیں دیکھا۔ ایسی صورت میں میں ایک اجنبی ملک کے پس منظر میں ناول کس طرح لکھ سکتا ہوں؟ مجھے اچانک خیال آیا کہ لوگ آخر ہزاروں سال قبل کے بارے میں کس طرح ناول لکھتے ہیں؟ اس کے لئے ریسرچ کرنا پڑتا ہے۔ جس ملک اور جس دور کے بارے میں لکھنا مقصود ہو اس کی تاریخ اور معاشرے کے بارے میں تحقیق کرنا پڑتی ہے اتفاق سے میرے ناول کا پس منظر صرف لندن کا پاکستانی اور ہندوستانی معاشرہ تھا جس کے بارے میں میرا پہلے ہی کافی مطالعہ تھا۔ پھر بھی میں نے اس بارے میں کافی تحقیق سے کام لیا۔ انگلستان خصوصاً لندن کے بارے میں انگریزی، اردو، بنگلہ اور ہندی میں جتنی کتابیں، سفرنامے، خود نوشت، سوانح حیات اور یادداشتیں ملیں پڑھ ڈالیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی تارکین وطن سے ملاقاتیں کیں اور جب کافی معلومات حاصل ہو گئیں تو میں نے ناول لکھنا شروع کیا۔ میں نے اس ناول میں لندن کو محض پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اصل اہمیت ناول کی ہے اس کے پس منظر کی نہیں۔"

شروع میں خود مصنف نے یہ لکھا ہے کہ "جس موضوع اور پس منظر میں میں نے یہ ناول لکھا ہے وہ قطعی مختلف اور انوکھا ہے"، اور دوسرے یہ کہ اپنی کہانی کا بھرپور تاثر قائم رکھنے کے لئے انہوں نے لندن کا پس منظر منتخب کیا۔

"کیونکہ وہ ایک آزاد معاشرہ ہے اور ناول کے کردار وہاں آزادانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں"۔ تو پھر آگے چل کر مصنف پس منظر کی اہمیت سے انحراف کر سکتے ہیں اس طرح وہ یہاں خود ہی تضاد کا شکار نظر آ رہے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پہلے جو تاریخی ناول اور دیگر کتابیں وغیرہ لکھی جاتی رہی ہیں وہ صرف واقعات سے آگاہی حاصل کر کے اور مزید کچھ کتابیں وروایتیں پڑھ کر لکھ دی جاتی تھیں لیکن آج کے دور میں یہ بات کچھ زیادہ قابلِ قبول نظر نہیں آتی کہ صرف ایک محدود تحقیق کے ذریعے پورا ناول اس ماحول کے پس منظر میں لکھ دیا جائے۔ قاری تو خیر اس سے مطمئن ہوتا ہی نہیں خود مصنف بھی اس سے کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آتے۔ اُن کا یہ جملہ کہ "اصل اہمیت ناول کی ہے پس منظر کی نہیں"۔ ان کی اندرونی کیفیت کا آئینہ دار ہے اور پھر ناول پڑھنے والا بھی یہ محسوس کر لیتا ہے کہ لندن کا ماحول دکھانے کے باوجود مصنف اس کو پوری طرح بیان نہیں کر پاتے ہیں۔ کیونکہ صرف بار، ہوٹل، کہر اور دُھند دکھا دینے ہی سے لندن کا ماحول واضح نہیں ہو جاتا۔

پاکستانی اور ہندوستانی لوگ عرصۂ دراز سے لندن میں رہتے ہیں اور باوجود اپنی اقدار کو عزیز اور زندہ رکھنے کے وہ اپنے رہن سہن اور طرزِ زندگی میں نمایاں تبدیلی پیدا کر چکے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ وہاں اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔

مصنف کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ جس موضوع پر انہوں نے قلم اُٹھایا ہے اس کے لئے بے باک ماحول کی ضرورت تھی۔ اس سے قبل بھی ناولوں، یہاں تک کہ افسانوں میں بھی مصنفین نے اپنی بات کو پُر تاثیر بنانے کے لئے اپنے پابند معاشرے کو چھوڑ کر دوسرے ممالک کے پس منظر کو اپنایا ہے۔ مثلاً معروف افسانہ نگار علی حیدر ملک کے مجموعے "بے زمین بے آسماں" کا ایک افسانہ "مس مارگریٹ" اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ان باتوں سے میرا مقصد اس بات کو غلط ثابت کرنا نہیں ہے کہ کسی اور ملک یا ماحول کے تناظر میں کوئی کہانی نہ لکھی جائے بلکہ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر کوئی دوسرا ماحول اپنی تخلیق میں اپنایا جائے تو وہ اتنا واضح اور مکمل ہو کہ قاری خود کو اسی ماحول اور مناظر سے لطف اندوز ہوتا محسوس کرے اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب مصنف کا اپنا گہرا مشاہدہ ہو۔

مصنف نے خود اسی بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے لندن نہیں دیکھا۔ بہرحال یہ اعتراف بھی ایک بڑی بات ہے۔ لیکن بہت اچھا ہوتا اگر وہ ایسا پس منظر منتخب کرتے جہاں وہ کچھ عرصہ رہے ہوتے یا وہاں کے مختلف مقامات سے انہیں مکمل آگاہی ہوتی۔

ان رد اعتراضات سے ہٹ کر اگر ناول کو دیکھا جائے تو یہ ایک اچھا ناول ہے۔ پوری کہانی میں کہیں جھول نہیں محسوس ہوتا اور یہ اپنے موضوع کی انفرادیت کی وجہ سے بہت بڑے حلقے میں پڑھا اور پسند کیا جا سکتا

بقیہ "صفحہ ۵۳ پر"

فضلؒ من اللہ

حامد سروش

یہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد کی بات ہے جب میں نے سیارہ لاہور، میں ایک قومی نظم بھیجی اور اس کے ساتھ نعیم صدیقی کو خط بھی لکھا۔ اسی ہفتے سیارہ سے نظم کی رسید ملی اور خط موصول ہوا۔ نظم بے حد پسند کی گئی تھی اور خط لکھنے والے کا نام فضلؒ من اللہ تھا۔ اس کے بعد میں سیارہ میں مستقل لکھتا رہا۔ اپیاکے افسانے، میری غزلیں، نظمیں، سیارہ میں چھپتی رہیں۔ خط و کتابت تکلفات سے آزاد ہو چکی تھی۔ سیارے میں انہوں نے میرے خطوط "نوائے سروش" اور بعد میں "سروشیات" کے عنوان سے چھاپنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ خط و کتابت بڑی پُر لطف ہوتی تھی۔ اسی دوران اپیا کا ناولٹ "تنہا اُداس لڑکی" شائع ہُوا تو میں نے اس کی دو کاپیاں سیارے میں تبصرے کے لئے بھجوائیں اور تاکید کی کہ نعیم صاحب سے گزارش کیجئے گا کہ وہ بقلم خود اس پر اپنی تفصیلی رائے لکھیں، اور سیارے میں چھاپیں۔ مجھے نعیم صاحب کا محاکمہ بہت پسند رہا ہے۔ یہ درخواست اس پسندیدگی کی وجہ سے کی گئی۔ کئی مہینے گزر گئے، نعیم صاحب نے کچھ نہ لکھا اور فضلؒ من اللہ صاحب اُن کی مصروفیات کی تفصیل ہر خط میں بیان کرتے رہے۔ جب میرا اصرار بڑھا تو انہوں نے سیارے میں "تنہا اُداس لڑکی" پر لکھا ہُوا وہ دیباچہ چھاپ دیا جو ناولٹ میں شامل تھا۔ مجھے نعیم صاحب سے یہ اُمید نہ تھی۔ میں نے فضلؒ من اللہ کو لکھا۔ آخر نعیم صاحب اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟ پہلی بار میرا لہجہ تلخ ہُوا تھا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں نے جس شخص کو مخاطب کر کے نعیم صاحب کے بارے میں یہ جملہ لکھا تھا، وہ کتنا رقیق القلب، کتنا نفیس اور کتنا باوفا ہے۔ فضلؒ من اللہ کا جواب فوراً ہی آگیا۔ اس جُملے نے ان کے جذبات کو مجروح کیا اور اس عقیدت کو بھی جو نعیم صاحب کے لئے اُن کے دل میں تھی۔ انہوں نے بڑی دردمندی سے گلہ کیا تھا کہ مجھے یہ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ مجھے اُن کے خط نے بہت متاثر کیا۔ میں نے لکھا۔ صرف آپ کی خاطر میں اپنا وہ جُملہ واپس لیتا ہُوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ان کو لکھا تھا کہ پُرانی بات ہے جب نعیم صاحب "چراغِ راہ" سے وابستہ تھے اور اس کی ایک تاریخی اشاعت جسے اشاعتِ خاص کا نام دیا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنا ایک افسانہ "میرا گاؤں" اور جیلانی بی اے کا افسانہ "بلعم بن بعور" چھاپا تھا

ترتیب

اداریہ۔ سیدہ حنا ۔ ۲

چہرے:۔ ۵ ، ۶ ۔ ڈاکٹر انور سدید ، جوگندر پال ، بلراج کومل ، اختر ہوشیار پوری ، افضل منہاس ساحل احمد ، سلیم آغا ، انوار فیروز ، سہیل اختر ، ساحر مصطفائی ۔

مطالعہ:۔

ڈاکٹر عبدالواسع کی تنقید / ڈاکٹر انور سدید ۔ ۷
تلوار اس کے ہاتھ / محمد فیروز شاہ ۔ ۱۲
بشیر سیفی کا شعری مجموعہ گفتار / سید فیضی ۔ ۱۵
ساغر صدیقی / قرۃ العین طاہرہ ۱۹
"اندھیری رات کا تنہا مسافر" ایک مطالعہ / رعنا اقبال ۲۴ ۔ ۲۸
فضل من اللہ / حامد سروش ۔ ۲۹ ۔ ۳۲

نظم

حادثہ / ڈاکٹر وزیر آغا ۔ ۳۳ عقائد تو ہم / فارغ بخاری ۔ ۳۳ ۔ میں اور وہ / بلراج کومل ۔ ۳۴
جائزہ / رضا مہدانی ۔ ۳۵ تین نظمیں / رب نواز مائل ۔ ۳۶ ۔ اجنبی سفر کی بشارت / شاہد عباس ۔ ۳۷
سخن ناگفتنی / محمد افضل صدیقی ۔ ۳۸ لرزتا ہوا پتہ / نسرین سروش ۔ ۳۸ گریز / لطیف کاشمیری ۔ ۳۹
یہ کیسا رشتہ ہے / سیدہ حنا ۔ ۴۰

انشائیہ:۔

گھاس کا ایک پات ۔ ۴۱ ۔ ۴۳

افسانہ:۔

انتم پاٹھ / جوگندر پال ۔ ۴۴ ۔ زائچے صداؤں کے / آثم میرزا ۔ ۵۴
بے بہر رات کا دروازہ / غلام دستگیر ربانی ۔ ۵۸ ، سیڑھی اور آدمی / حامد سروش ۔ ۶۱

غزل:۔

اختر ہوشیار پوری ، افضل منہاس ، ساحل احمد ، جمیل ملک ، سجاد بابر ، اکبر حمیدی ، ساحر مصطفائی ، سہیل اختر ، انوار فیروز ، ندیم نیازی ، بشیر سیفی ، شوکت مہدی ، آثم فردوسی ، ساغر مشہدی ، خاور اعجاز ۶۳ تا ۷۰

تبصرے:۔

ادارہ ۔ ۷۱

بزم احباب:۔

قارئین ۔ ۷۴

خود اُن کے افسانے میں بعض جملے قابلِ اعتراض حد تک بے باک تھے اور بلعم بن بعور تو اسلام پسند ادیبوں کی مسلسل نکتہ چینی کا سبب بن گیا تھا۔ بالخصوص ایک عورت دو مَلک کے مصنف اسعد گیلانی نے تو اعتراضات کی بھرمار کر دی تھی۔ تب نعیم صاحب نے جیلانی کے افسانے پر اس عنوان سے "قلم اُٹھایا، جیلانی کا افسانہ عظیم کیوں کر ہُوا"، انہوں نے جس بالغ نظری سے افسانہ پر اپنا محاکمہ پیش کیا اسلامی تنقید میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بس اُن کی یہی ادا مجھے بھا گئی تھی۔ مجھے علم نہ تھا کہ اب وہ تائب ہو گئے ہیں۔ اگر مجھے علم ہوتا تو میں ناولٹ کبھی اُن کو نہ بھیجتا۔

اس خط کے بعد جو تھوڑی سی دُوری ہمارے درمیان حائل ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اور ہم پھر محبتوں کے راستوں پر چل پڑے۔ لیکن اچانک ایک موڑ پر ہم جُدا ہو گئے۔ اور یہ عرصہ دس بارہ سال پر محیط تھا۔ اُن دنوں میں گورنمنٹ کالج پشاور میں تھا کہ مجھے حیران خٹک کا دعوت نامہ موصول ہُوا جس میں نعیم صاحب کے ساتھ ایک نشست کی اطلاع تھی جو اس وقت کے انٹر کانٹ کے خوشحال روم میں ہونی تھی۔ میں نے اپیا سے کہا۔ چلتے ہیں نعیم صاحب سے مل لیں گے تھوڑی سی چینج ہو جائے گی۔ انہوں نے معذرت کرتے ہُوئے کہا۔ اتنے بہت سے مولویوں میں اکیلی خاتون بھلا کیسی لگوں گی۔ نہیں تم جاؤ میں نہیں جاتی۔ لیکن میرے اصرار کے آگے انہیں ہار ماننا پڑی۔ اور واقعی خوشحال روم میں وہ واحد خاتون تھیں جو بن بُلائی شرکت کر رہی تھیں۔ نعیم صاحب سے ہم نے اُن کے خُوبصورت اشعار سُنے۔ اسی دوران میں نے نعیم صاحب کو چِٹ بھیجی کہ فنکشن کے بعد ہم سے ملیں۔ لیکن ہُوا یہ کہ نعیم صاحب نے دوسری نشست میں ہمیں کلام سنانے کے لئے دعوت دلوا دی۔ میں نے اور اپیا نے اپنے اشعار سنائے۔ اس کے بعد جب جلسہ ختم ہُوا تو نعیم صاحب بڑی محبت سے ملے۔ میں نے بڑی بے چینی سے پُوچھا۔ فضلِ من اللہ کیسے ہیں۔ کہنے لگے آئے ہُوئے ہیں وہ دیکھیں سٹال سجایا ہے۔ اپیا نعیم صاحب سے باتیں کرتی رہیں اور میں سیدھا اُس شخص کے پاس پہنچا جو کتابیں سجائے بڑے وقار سے بیٹھا تھا۔ سادا سادا، منکسر مزاج دھیمے لہجے والا شخص۔ ہم اس طرح بغلگیر ہُوئے جیسے صدیوں کے بعد ملے ہوں۔ جیسے ہم ایک دوسرے کو صدیوں سے پہچانتے ہوں۔ گفتگو زیادہ نہیں ہُوئی۔ لیکن وہ منظر آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

ہماری دوسری ملاقات اس کے فوراً بعد ۱۹۸۳ء میں لاہور میں ہُوئی۔ اپیا کے افسانوں کی کتاب "پتھر کی نسل" کی تعارفی تقریب تھی۔ ڈاکٹر آغا سہیل صدرِ محفل تھے۔ محفل بڑی بھرپور تھی۔ اس محفل میں افسانہ نگار نے اپنا بدنام افسانہ "شراکتی کھاتہ" پیش کیا تھا۔ محفل کے اختتام پر جب ہم باہر نکل رہے تھے ایک شخص ہمارے پاس آکر رُک گیا۔ اس کے ہاتھ میں ناشتہ دان تھا، سادہ کپڑوں میں ملبوس۔

فضل؟ من اللہ۔ اس نے تعارف کرایا۔ اور ہم ایک دوسرے سے گرمجوشی سے ملے۔ میں نے کہا، میں چہرے بھول جاتا ہُوں لیکن آدمی کو نہیں بھولتا۔ اور آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔

پھر ہم نے سینکڑوں خطوط لکھے، بے شمار ملاقاتیں ہوئیں۔ میں۔ بلکہ ہم ہیرو ورشپ کے قائل نہیں۔ زندگی میں بے شمار لوگوں سے ملے لیکن سب کو اپنے ہی جیسا پایا۔ کوئی بھی آئیڈیل نہ بن سکا۔ ہمیشہ یوں محسوس ہوا جیسے ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔ ایک آدھ مرتبہ کسی شخصیت نے بے حد متاثر کیا۔ اس کے بارے میں کچھ لکھا لیکن بعد میں لفظوں کی عدالت میں مجرم قرار دیا گیا تب سے میں نے شخصیات پر لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ فضل من اللہ اندر ہی اندر روح میں سرایت کرنے لگے۔ میں لاہور پہنچتا، بہت صبح ہوتی میں بیگ اٹھاتے سیدھا وحدت کالونی پہنچتا۔ ان سے ملتا، پھر واپس انارکلی آتا۔ ہوٹل میں کمرہ بک کراتا، شیو بناتا، کپڑے ٹھیک کرتا، اس کے بعد اپنے کام سے نکلتا۔ اپیا کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ (جھوٹی کہانیاں) انہوں نے ہی چھاپا اور اس کی تعارفی تقریب بھی منعقد کرائی۔ جھوٹی کہانیاں کی اشاعت کے دوران ہمیں بار بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں مذہبی لوگوں کی انتہا پسندی نہیں ہے۔ ان کے رد عمل میں نئے حالات سے مفاہمت کا جذبہ ہے۔ جب اُن سے سیارہ کی ایڈیٹری واپس لی گئی تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ پہلی بار اُن کے خط میں شدید دکھ کی لہریں تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ رات سیارہ کی نئی انتظامیہ کے لوگ، ۲۔ وحدت کالونی آئے اور سب سمیٹ کر لے گئے۔ انہوں نے لکھا کہ میں ساری رات سو نہیں سکا۔

دھچکا مجھے بھی لگا۔ اُن کی ادارت میں سیارہ جس معیار تک پہنچ گیا تھا اس میں ان کا بہت بڑا رول تھا۔ نعیم صاحب اپنی کم آمیزی اور لیئے دیئے رہنے کے باعث (یہ تبدیلی ان میں چراغ راہ کے بعد آئی تھی) ادیبوں اور شاعروں کا ایسا بالغ نظر اور وسیع المشرب حلقہ نہیں بنا سکتے تھے۔ اور ایک مخصوص ادبی نظریہ کی سختی سے اشاعت و ترویج، پرچے کو مختلف الخیال ادیبوں کو یکجا کر کے ان میں صحت مند رجحانات پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ فضل من اللہ کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے سیارہ کی حکمتِ عملی پر آنچ نہیں آنے دی اور لکھنے والوں کا ایک ایسا حلقہ بھی بنا لیا جس نے شعوری اور لاشعوری طور پر سیارے کی حکمتِ عملی کو نہ صرف سراہا بلکہ اسے آگے بڑھانے کی کوشش بھی کی۔ یہ ایک ایسی ذہنی تربیت تھی جو صرف اور صرف فضل من اللہ کے اسکول آف تھاٹس سے مل سکتی تھی۔ وہ ایک ایسی کاریز تھے جو اندر ہی اندر جڑوں کو سیراب کرتے رہے۔ شاخوں سے لگنے کی انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔

صاف باطن صاف ضمیر، اعلیٰ خوبیوں سے مزین، نگہ بلند سخن دلنواز، وہ ہمارے لئے ایک اہم فیملی ممبر کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ جھوٹی کہانیاں کی تعارفی تقریب کے موقع پر ہم سب لاہور گئے۔ قیام ہمارا حسبِ معمول ہوٹل ہی میں تھا۔ لیکن ایک شام، ہم سب (اپیا، نسرین اور سلمان) اُن کے گھر پہنچ گئے۔ یوں لگا جیسے اپنے گھر ہی میں آ گئے ہیں۔ وہ ہمارے درمیان بیٹھے مختلف موضوعات پر دھیمے دھیمے بولتے رہے،

بچے ہماری خاطر میں لگے رہے۔

مجھے یاد آیا ایک دفعہ ہم فضلؔ من اللہ ہی کے قبیلے کے ایک اور صاحب سے (جو ماشاءاللہ خاصے اچھے ادیب اور شاعر ہیں) ملنے کے لئے گئے۔ شدید گرمی تھی۔ میں ایپا اور سلمان انار کلی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے اور ابلاغ کی طباعت کے سلسلے میں ان سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ وہ اپنے دفتر میں موجود نہیں تھے۔ ہم نے اُن کے گھر ٹیلیفون کیا اور بتلایا کہ ایپا بھی میرے ساتھ ہیں اور ہم آفس میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ ٹیلیفون پر وہ ملے بھی، آدھے گھنٹے کے اندر آنے کا وعدہ بھی کیا لیکن نہ آتے۔ میں نے پھر فون کیا پتہ چلا کہ وہ پریس گئے ہوئے ہیں۔ پریس کا نمبر لے کر فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آئے ہی نہیں ہیں۔ پھر گھر فون کیا تو کوئی جواب نہ ملا۔ حیرت ہوئی۔ ہم نے تقریباً تین گھنٹے شدید گرمی میں اُن کے آفس میں گزارے۔ تب ایپا نے کہا وہ نہیں آئیں گے کیونکہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور میں عورت ہوں، اور عورت کسی عمر کسی کیلیبر کی ہو، ان لوگوں کی نظر میں وہ محض عورت ہوتی ہے۔ بعد میں اس کی تصدیق یوں ہوئی کہ ان صاحب نے معذرت کا کوئی خط بھی نہیں لکھا ٹال دیا۔ وبال سا ہائے فضلؔ من اللہ وہ تو ہم سے ملنے ہمارے ہوٹل آگئے تھے۔ کیسا پختہ ایمان تھا، کیسا پاکیزہ کردار تھا، کیسا بے نفس شخص تھا۔

نعیم صاحب سے اُن کی عقیدت آخر دم تک قائم رہی اس کے باوجود کہ اُن سے سیارے کی ادارت لے لی گئی تھی۔ اس کے باوجود کہ ان کے مراسم میں نشیب و فراز آتے۔ اور ایک آدھ مرتبہ سیارہ کے صفحات بھی آلودہ ہوتے، وہ ان کے آئیڈیل رہے۔ اگر انہیں پتہ ہوتا کہ ان کا معشوقِ ستم پیشہ اُن کے مرنے کے بعد اُن پر مضمون لکھے گا (روایتی ہی سہی) تو مجھے یقین ہے کہ وہ غالب کی طرح حیلہ سازی سے کام نہیں لیتے بلکہ اس خوشی سے فوراً ہی مر جاتے، دل کے معاملے اتنے اُلجھے سلجھے ہوتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے۔

اور اب جب میں فضلؔ من اللہ پر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں میرا ذہن چاروں طرف بھٹک رہا ہے۔ ماضی میں ان کے خطوط بکھرے ہوئے ہیں حال میں ان کی موت کا دُکھ کالے بادل کی طرح محیط ہے۔ میں نے ڈاکٹر انور سدید کے تعزیتی خط کے جواب میں لکھا تھا (لیکن ٹھہریے پہلے یہ سوچیں کہ انہوں نے فضلؔ من اللہ کی وفات پر مجھے تعزیتی خط کیوں لکھا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ پہلے اور آخری شخص ہیں جنہیں ہمارے درمیان اس ذہنی اور روحانی تعلق سے کما حقہٗ آگاہی ہے) کہ "مجھے اس خبر پر یقین ہی نہیں آیا ہے" انہوں نے اپنی وفات سے پانچ روز پہلے ہی تو مجھے خط لکھا تھا (ابلاغ شمارہ ۵) اور اس میں سوائے بخار کے کسی اور تکلیف کا ذکر نہیں تھا۔ یہ میرے اس خط کا جواب تھا جس میں میں نے انہیں نئے گھر اور پرانے یار لاسید گل بادشاہ) کی مبارکباد دی تھی۔ فضلؔ من اللہ نے ایک خط میں اطلاع دی تھی کہ وہ پشاور آرہے ہیں (آئے نہیں تھے) اور گل بادشاہ کے یہاں رات کو قیام کریں گے۔ میں نے اس خط کے جواب میں مومنؔ کا شعر لکھ بھیجا تھا ؎

اے شب وصل غیر بھی کاٹی تو مجھے آزمائے گا کب تک

(جاری ہے)

حادثہ

ڈاکٹر وزیر آغا

سکوت کے لب سِلے ہُوئے تھے
تھکی ہُوئی رہگذر لپٹ کر
خموش پیڑوں سے - سو چکی تھی
لڑھکتے پتھر بھی تھم گئے تھے
ہوا کا رتھ گہرے کھڈ میں گر کر
ہزار قاشوں میں بٹ چکا تھا
ڈرے ہُوئے خوشنوا پرندے
دبیز پتوں، گھنیری شاخوں کے
کالے کمبل میں گم پڑے تھے
تھی اس قدر بیکراں خموشی
تھا اس قدر دم بہ خود اندھیرا
کہ میں تھکی رہگذر سے لگ کر
گذرتے لمحوں کی چاپ تک کو
خود اپنے کانوں سے سن رہا تھا

عقائد، توہّم

فارغ بخاری

عقائد توہم کے پھیلے ہُوئے
آہنی مورچوں میں
اکیلے کہاں تک
نبرد آزما رہ سکو گے
زمانے کی وسعت پہ چھائے ہُوئے
لاکھوں ایسے محاذوں پہ
پیہم شکستوں کا یہ سلسلہ
یونہی بڑھتا رہا گر
تو پھر کیا کرو گے
ذہانت کہ جس پر تمہیں ناز ہے
اگر اس نے ہی
ناگ بن کر تمہیں ڈس لیا
تو اس زہر کا کیا مداوا کرو گے۔

میں اور وہ

بلراج کومل

مجھ سے اچھا نہیں
ٹھیک مجھ سا بھی شاید نہیں
وہ جو اک شخص ہے شہر میں
لوگ کہتے ہیں اک دوسرے کے ہیں ہمزاد ہم
اس کی تصدیق کوئی بھی لیکن خدا جانے کیوں
روبرو وہ آئے گر تا نہیں
اس کا چہرہ کتابِ شمار سہی لیکن اسے
کوئی پڑھتا نہیں
میرا چہرہ دبا کر وہ دیوار پر
چیتھڑا چیتھڑا پوسٹر کی طرح
اس میں تحریر کا متن کیا تھا
کوئی کچھ نہیں جانتا
شہر کے قتل، دنگے فسادات کے
سیلِ معمول میں
یوں بھی ہر شخص اپنی حفاظت کی خفیہ تدابیر میں
روز و شب ایسے مصروف ہے
ساعتِ روزِ آخر ہو جیسے درِ زندگی پر کھڑی

وہ جو خاموش ہے
باعمل ہے
سوادِ شہادت میں آخر اُتر جائے گا
میں جو دیوار پر
پوسٹر کی طرح، پھڑپھڑاتا ہوں آج
عین ممکن ہے میں
انہدامِ مسلسل کی تصویر کا
شائبہ ہی رہوں
میرے ہمزاد کو اک زمانہ جیتے
ایک حرفِ ملامت کی مانند میں
اس کی تعظیم میں
حشر تک سب کی آنکھوں میں رسوا ہوں

(انڈیا سے)

جائزہ

رضا ہمدانی

آسماں کی وسعتیں قریب ہیں
بال و پر اگر نہ ہوں
رفعتوں کے ہمنوا نشیب ہیں
ہمسفر اگر نہ ہوں

مطربوں کے گیت سُن رہے ہیں ہم
اس عمل کے دور میں
مصلحت کے جال بُن رہے ہیں ہم
آندھیوں کے زور میں

کہکشاں کی منزلوں سے گھوم کر
پربتوں کی عصمتوں کو چُوم کر
کنکر اک اُٹھا لیا

پھر وہی ملوکیت کا راگ ہے
پھر وہی ہے زیر و بم
پھر وہی ستمگری کی آگ ہے
اور جل رہے ہیں ہم

کب جہاں کو درد سے ملے نجات
کب وہ عہد جگمگاتے
کب بنے نیا نظامِ کائنات
کب وہ انقلاب آتے

قہقہوں کی زد سے جاں بچا سکیں
مُفلسوں کے بام و در
زر فشاں محل نہ مسکرا سکیں
جھونپڑوں کو دیکھ کر

تین نظمیں

رب نواز مائل

دُھوپ سے اپنا تعلق

مجھے اِس دُھوپ سے لینے تو دو کچھ
جسے میں نے عجب محبوب اپنا
فقط اِس پل نہیں
عُمروں سے جانا
مجھے اِس دُھوپ سے لینے تو دو کچھ
جو پیڑوں کو ثمر، رستوں کو رونق
ہوا کو پیرہن اک آتشیں سا
طلب کو رُوپ، اک ایک مرجبیں سا
نہ جانے ایسا کیا کیا
روز ہی دے
مجھے اس دُھوپ سے لینے تو دو کچھ
کہ جس کو یا کہیں، سایوں نے خود میں
کہ جس کو یا کہیں، لمحوں نے خود میں
چھپا کر، دیر سے، رکھا ہے مجھ سے

شہر در شہر صدا

شہر در شہر اپنی صدا
بے بصر اِس طرح رہ کے بھی
جیسے ہم آج ہیں
جانے کس شے کی ہو
جانے کس رنگ کی
کہ حیاتِ طلب، جس سے پائے جہاں
"تازہ تازہ سوؤں!

اُس شام کا ذکر

آج کی شب اُس شام کا ذکر
جب کہ ملے تھے پہلی بار
کیسے تواتر سے یُوں ہو
رنگِ دگر ہستی کا کہاں
پیار ہی کیوں اک اپنا کہے
آج کی شب اُس شام کا ذکر
(خوف کا منظر جیسے ہٹے)
سب کے لئے پیغام ہو یُوں
سب کے لئے انعام ہو یُوں

اجنبی سفر کی بشارت

شاہد عباس

مدّتوں سے زندگی ہے یکہ و تنہا رواں
بے خبر جائے کہاں ؟
ہمسفر کا بی میں ہے اُس کے کاروانِ فرطِ شوق
کوئی لیکن ہمنوا ــــ
ہمدرد، منزل آشنا ؟
بہہ رہا ہُوں میں کٹھن حالات کی لہروں کے ساتھ
ایک تنکے کی طرح،

ہر قدم سیلِ رواں
دل کی نازک پنکھڑی پر
فرض اور احساس کا کوہِ گراں
اور لب پر ایک حرفِ معتبر ــــ
جیسے اک تنہا شجر
اجنبی سی اک گھنی چھاؤں لئے
خار کی سوزن سے چاکِ دل سیئے
اپنے اشکوں کو پیئے

وقت صحرا ہے، تمنا پھُول ہے
ہر طرف اک دُھول ہے
چاندنی کا رقص اور ریگِ سَراب
گفتگو کرنے لگے ــــ
پھُول کے انجام سے ڈرنے لگے
چاند کی کرنوں کے نیزے
بے صدا جذبوں میں کھو کر دفعتہً
پھُول پر مرنے لگے

کیا سفر؟ کیا ہمسفر؟ کیا اشکِ تر؟
رقص، نیزے، چاندنی
پھُول، صحرا اور سَراب،
جیسے خواب ــــ
رُوح میں گھُلتی ہُوئی تنہائیاں
گہری گہری کھائیاں

اجنبیت کی زمیں
اپنے ہونے اور نہ ہونے کا یقیں
جیسے سب بھٹکے ہُوئے
دار پر لٹکے ہُوئے
کہہ رہے ہوں مدّتوں سے زندگی ہے
یکہ و تنہا رواں
بے خبر جائے کہاں ؟ ؟ ؟

سُخنِ ناگفتنی

محمد انور ساجد

سفر طویل راہ گم ___
مگر وہ ہم سخن جو میرا ہم سفر رہا
نصیب دُشمناں
وہ میرے پاس ہو کے بھی
مجھی سے بے خبر رہا
اسی کے نام میں نے
اپنی ہر خوشی ، ہر آرزو تیاگ دی
وہ چُپ رہا اگر تو کیا
نظر سے اپنی
اک الم کی داستاں سنا گیا
کہانیاں، حقیقتیں ، رفاقتیں ، رقابتیں
سفر کی سب صعوبتیں ، ہزیمتیں ، ندامتیں
یہ اس کی داستان تھی ،
یہ میری داستاں بھی ہے

لرزتا ہُوا پتّہ

نسرین نرش

ایک سوکھا ہُوا زرد پتّہ
شاخ پر اٹکا ہُوا
لرز رہا ہے
اپنے انجام سے
باخبر ہے
کسی بھی لمحے وہ
گر پڑے گا
نئی کونپلوں
سبز پتّوں کی خاطر

گریز

لطیف کاشمیری

اِن فضاؤں سے بہت دُور
جفاؤں سے پرے
عرصۂ دہر کے پُر ہول اندھیروں سے پرے
میری محبوب کہیں دُور بہت دُور چلیں

جب کبھی میرے ارادوں کی صلابت کا خیال آیا ہے
پھر وں آنکھوں میں لئے ایک بے نام سا غم
اِک انوکھا سا سوال
تم تصوّر کے پُر اسرار حسیں زینوں پر
جانے کیا سوچ کے رک جاتی ہو،

چند خوش فہم خیالات کی بُن کر کرنیں
چند موہوم اُمیدوں کی جلا کر شمعیں
محض تخیل کے بیکار سہاروں پہ بھروسہ کر کے
تم سمجھتی ہو بھلے دن کبھی لوٹ آئیں گے
راحتِ عالمِ انساں کی سحر آئے گی

تم بھی قسمت کے تصوّر پہ یقیں رکھتی ہو
کتنی انجان ہو تم
کتنی نادان ہو تم
یہ عزائم کا نقاہت سے اُترتا چہرہ
اور مقدّر کی پرستش کے چڑھاتے ہوئے خول
یہ سیاہی کے گھنیرے بادل
ذہنِ انسان سے چھٹتے ہوئے کہنہ جالے
مکڑیاں جن کو شب و روز بُنا کرتی ہیں

اُجڑا اُجڑا سا ہے زیست کی دُلہن کا سہاگ
کلبلاتے ہیں ہر اک سمت زر و سیم کے ناگ
زندگی کیا کسی دیوار سے اُکھڑا ہوا پتھر ہے کوئی
جو فقط ٹھوکریں کھاتا ہے سرِ راہ گزر
یا کوئی جنسِ فرومایہ ہے بکنے والی
نفع خوروں نے جسے

اداریہ

سخن ہائے گفتنی

گزشتہ دنوں عوامی جمہوری حکومت کی یہ تجویز ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات میں آئی کہ ادیبوں کی فاؤنڈیشن کے قیام کا مسئلہ زیرِ غور ہے تو خوشی ہوئی کہ چلو کوئی تو آیا جس نے اِس بے آسرا طبقے کی انگلی پکڑنے کا عزم ظاہر کیا۔ اگر یہ تجویز بیوروکریسی کی نذر نہ ہوئی اور اس کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو یقیناً یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا جسے پاکستان کی تاریخ میں آدم جی ایوارڈ سے زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، کہ اس تجویز میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس نے اس کو خاصا محدود کر دیا ہے "مستحق ادیبوں"۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بھی ادیب معذور یا ناکارہ ہو جائے تو فاؤنڈیشن اس کے علاج معالجہ میں اس کی مدد کرے گی اور اس کی وفات حسرت آیات کے بعد اس کی بیوہ اور پسماندگان کی مالی امداد کرے گی۔ اگر اس مجوزہ فاؤنڈیشن کا مطلب یہی ہے تو پھر اس میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ مستحق کے لفظ کو ذرا بلیغ معنوں میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ دراصل مستحق ادیب وہ ہیں جو اپنے ذاتی وسائل سے ادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی تخلیقات منظرِ عام پر نہیں آتیں، کچھ ایسے ادیب و شاعر جو اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر، اپنی خواہشات کی نفی کر کے اپنے خرچ پر کتابیں چھپوا لیتے ہیں لیکن ان کی نکاسی کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں ہوتا۔ حالانکہ ملک میں بے شمار لائبریریاں موجود ہیں۔ اور ایک ہزار کتابوں کی کھپت بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ لائبریریوں کے علاوہ ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو یہ شائع شدہ کتابیں خرید سکتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں حکومت کی براہِ راست مداخلت ادیبوں کی بے چینی دُور کر سکتی ہے اور وہ کسی قدر بہتر مالی حالات میں زندگی گزار سکتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ فاؤنڈیشن ان پر ترس کھا کر اور مستحق سمجھ کر ان کی مالی معاونت کرے کیوں نہ فاؤنڈیشن ان کی کتابیں چھپوا کر اور اُن کو راائلٹی دے کر اُن کی انا کا تحفظ کرے اور عزتِ نفس کو قائم رکھے۔ پچھلے دنوں اخبارات میں ایسے کئی اداروں کے اشتہارات پڑھے جو نئی شائع شدہ کتابوں کی کئی جلدیں خریدنے پر تیار تھے لیکن جب اشتہار غور سے پڑھا تو پتہ چلا کہ وہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی کتابوں کے طلبگار ہیں ان میں لٹریچر شامل نہیں تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شعر و ادب کی ہر سطح پر

اپنے مقصد کے لئے
اک بہت عام سے بازار میں لا رکھا ہے

عرصۂ دہر کے بازاروں میں
جہاں انساں کا لہو بہتا ہے پانی کی طرح
جہاں انسان فقط آلہ ہے افزائشِ سیم و زر کا
جہاں انساں کی پسینے میں نہاتی محنت
چند چمکیلے سے سکوں کے عوض بکتی ہے
جہاں لٹتا ہے تقدس
جہاں بکتی ہے حیا
جہاں مرتی ہے محبت
جہاں لٹتی ہے وفا
اور جہاں بکتا ہے آدم
جہاں بکتا ہے خدا
جہاں ہر چیز سرِ عام بکا کرتی ہے
عرصۂ زیست کو بازار بنانے والے
ان خداؤں سے بہت دور
گناہوں سے پرے
اس تمدن کے پُر آشوب اندھیروں سے پرے
میری محبوب کہیں دور بہت دور چلیں

یہ کیسا رشتہ ہے

سیدہ حنا

میں تیری ہوں تو سب کا ہے
یہ کیسا رشتہ ہے
میں تجھ کو چاہوں
تجھ کو سوچوں
دھیان کسی کا دل میں نہ لاؤں
میری ہر مانگ ہو تو ہی،
میری ہر آس ہو تو ہی،
تیری طلب میں کوچہ کوچہ
گھوموں
تجھ کو ڈھونڈوں
تیری ایک جھلک کو ترسوں
تیرے درشن کی پیاسی کہلاؤں
میری ہر سانس پہ تیرا
ہر دم، ہر پل پہرا
پیت کی ڈوری تجھ سے بندھی ہو
میرے چاروں اور تو ہی ہو
میرا جیون سارے کا سارا
تیرا اور سارا تیرا
تو چاہے جس کو چاہے
جس کا چاہے بن جائے
میں تیری ہوں تو سب کا ہے
یہ کیسا رشتہ ہے

گھاس کا ایک پات

جانِ رسکن
سلیم آغا قزلباش

گھاس کا ایک پات لیجئے اور ایک منٹ کے لئے اس کی باریک تلوار ایسی بانسری نما سبز چھال کا بغور مشاہدہ کیجئے۔ اس میں آپ کو بظاہر کوئی اچھائی یا خوبصورتی نظر نہیں آئے گی۔ اس میں آپ کو نہایت معمولی استقامت اور نہایت ادنیٰ قدوقامت ملے گا اور چند نازک لمبی لکیریں ایک نقطے پر مرتکز ہوتی دکھائی دیں گی ۔ یہ نقطہ ایک مکمل نقطہ نہیں ہوگا بلکہ کُند اور نامکمل نظر آئے گا جو فطرت کی صناعی کا کوئی قابلِ قدر یا بظاہر قابلِ توجہ نمونہ نہیں ہوگا۔ یوں لگے گا جیسے یہ اس غرض سے تخلیق کیا گیا ہے کہ اسے آج بھی قدموں تلے روندا جاتے اور کل بھی اور پھر اُسے تنور میں جھونک دیا جائے۔ یہ پات ایک زرد رنگ کا اندر سے کھوکھلا ڈنٹھل ہوتا ہے، کمزور اور چپٹا سا، جو اس کی ریشہ دار، ہلکے بھورے رنگ کی جڑوں تک اُترا نظر آتا ہے اور اس کے باوجود اس کے بارے میں بغور سوچیں اور فیصلہ کریں کہ وہ تمام چمکدار پھول جو موسم گرما کی فضا میں دیکھتے ہیں اور وہ تمام تنومند اور خوش اندام شجر جو آنکھوں کو طراوت بخشتے یا غذا مہیا کرتے ہیں مثلاً سرو قد پام اور صنوبر، شاہ بلوط اور خوشبودار گلگل اور لدی پھندی انگور کی بیل ۔ کیا اِن میں کوئی ایسا بھی ہے جس سے انسان نے اتنی محبت اور خدا نے جس کی اتنی قدر کی ہو جتنی کہ ایک ہلکے سبز رنگ کے اس مختصر سے نقطے کی (یعنی گھاس کے پات کی) میرے نزدیک یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارا خداوند جب معجزہ دکھانے کو تھا تو یوں لگتا تھا جیسے کہ لوگوں کے جمِ غفیر کے لئے اُس کے پاس سب سے زیادہ متاثر کن، روٹیوں والا معجزہ" تھا۔ اس نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ٹکڑیوں کی صورت میں " سبز گھاس کے اوپر" بیٹھ جائیں۔ وہ دراصل اُنہیں بحر و بر کی بنیادی غذا عطا کرنے والا تھا یعنی انسانی غذا کا سادہ ترین نمونہ! اُس نے اِنہیں جڑی بوٹی کا بیج عطا کیا۔ انہیں اس جڑی بوٹی کے اوپر بیٹھنے کا حکم صادر فرمایا جو اُن کی خوشی اور آرام کے لئے اپنی موزونیت کی بنا پر اتنا ہی بڑا انعام تھا جتنا کہ اس کا پھل اُن کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے تھا۔ چنانچہ یہ اکلوتا حکم اور عمل پوری طرح سمجھ میں آگیا کہ کس طرح خداوند نے ہر کہ ومہ کی آسودگی، تشفی اور غذا کے معاملے کو روئے زمین کی جملہ بیلوں والی انواع میں سے اِس سادہ ترین اور بظاہر سب سے حقیر شے کو مرحمت فرمایا تھا۔ اور پھر اس نے اپنے مقصد کو بخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا

بھی تھا۔ اس پر غور کیجئے کہ ہم اس چراگاہ کے کس قدر دست نگر ہیں اور اس سیاہ زمین پر پھیلی ہوئی چمکدار تہ کے ان گنت نازک اور امن پسند نیزوں یعنی گھاس کے بھی! "یہ کھیت!" لحظہ بھر کے لئے اس سب کچھ کا خیال کیجئے، جسے ہمیں ان دو لفظوں میں پہچان لینا چاہیے تھا، ساری کی ساری بہار اور گرمی ان میں موجود ہے۔ خاموش خوشبودار راستوں پر سیر۔ دوپہر کی تپش میں استراحت، گایوں بھیڑوں کے ریوڑوں کو دیکھ کر خوشی۔ چرواہوں کے اسلوب حیات کی قوت اور استغراق۔ اس دنیا پر اترنے والی زمردیں دھاریوں کے نیلے سایوں کی صورت میں خورشید کی ضو (جس نے ہر کہیں سیاہ خاک یا جھلسانے والی گرد کو روک رکھا تھا)۔ رواں دواں سبک رفتار ندیوں کے ساتھ ساتھ چراگاہیں۔ کوتاہ قد پہاڑیاں اور نازک کنارے۔ نیچے کے ترچھے ڈھلانوں کے اوپر اٹھتی ہوئی سمندر کی نیلی لکیر۔ تازہ سبزہ زار، صبح کی شبنم پاشی سے دھندلاتے ہوئے یا نیم گرم شام کو رکی ہوئی سورج کی روشنی میں نرم و گداز، مستی بھرے قدموں سے سلوٹ زدہ ۔۔ جو محبت بھری آوازوں کو ملائم کر دیتے ہیں۔ ان سب کا لب لباب ان دو سادہ الفاظ میں موجود ہے، اور یہی سبھی کچھ نہیں ہے، ہم اپنی ہی سرزمین پر رہتے بستے ہوئے اس سماوی انعام کی وقعت کا پورے طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے۔ پھر بھی اگر ہم اس چراگاہ کی خوشبودار لامحدودیت پر ذرا دیر کے لئے غور کر لیں تو شیکسپیئر والا مخصوص حظ ہم پر زیادہ سے زیادہ آشکار ہو جائے گا۔ ہر چند کہ قاشوں کی صورت میں ملے گا۔ بہار کے موسم میں ان چراگاہوں میں نکل جاؤ، جن کی ڈھلانیں سوئٹزرلینڈ ایسی جھیلوں کے کناروں سے لے کر پہاڑیوں کی زیریں جڑوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں پر دراز قد GENTIAN اور سفید رنگ نرگس میں خلط ملط ہو کر گھاس زیادہ گھنی اور فراواں صورت میں اگتی ہے، اور جب تم بل کھاتی پہاڑی پگڈنڈیوں پر محراب دار شگوفوں سے لدی شاخوں کے نیچے سے گزرو۔ یعنی ان پگڈنڈیوں پر جو سدا سے سبز ساحلوں کے کناروں اور ٹیلوں پر سے ابھرتی اور ڈوبتی ہوئی نشیب کی معطر ہریلی ڈھلانوں سے لے کر نیلے پانیوں تک پھیلی ہوتی ہیں اور جن پر یہاں وہاں تازہ تازہ کٹے ہوئے گھاس کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں جو ساری فضا کو مسحور کن مٹھاس سے لبریز کر دیتے ہیں۔ تو تم بلند پہاڑیوں کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھنا جہاں ہمہ وقت ہرے بھرے سبزے کی لہریں صنوبر کے سایوں کے درمیان اپنے طویل ناکوں سے گزرتی ہوئی خاموشی سے جھوم رہی ہوتی ہیں۔ تب ہم شاید بالآخر انجیل کے ۱۴۷ ممبر کے گیت کے ان پُر سکون الفاظ کے مطلب کو جان لیں کہ "اس نے گھاس کو تخلیق کیا کہ وہ پہاڑیوں کے اوپر اُگے۔"

اس موضوع سے منسلک اور بھی متعدد سبق ہیں، جنہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً دیکھئے کہ گھاس کی نرالی خصوصیات جو اسے خدمتِ خلق کے لئے موزوں قرار دیتی ہیں، عجز اور زندہ دلی ہیں! اس کی عاجزی اس بات میں ہے کہ اسے حقیر ترین خدمات کی بجا آوری کے لئے خلق کیا گیا ہے ۔ یعنی پامال کئے جانے اور بطور چارہ استعمال کئے جانے کے لئے! گھاس کی زندہ دلی اس بات میں ہے کہ یہ ہر نوع کے تشدد اور اذیت کے

دوران بھی خوش باش رہتی ہے۔ آپ اس پر بیلن پھیر دیں تو یہ اگلے روز پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے، آپ اسے کاٹ دیں تو یہ اپنی شاخوں کو فزوں تر کر لیتی ہے جیسے گویا آپ کی احسان مند ہو۔ آپ اسے پاؤں تلے روندیں تو یہ تیز تر مہک دیتی ہے۔ موسم بہار کی آمد پر یہ ساری دھرتی کے ساتھ مل کر جشن مناتی ہے۔ پھولوں کے بوقلموں شعلوں کے ساتھ ٹمٹماتے ہوتے اور اپنی ثمردار قوت کی نرم گہرائی میں لہراتے ہوتے جب موسم سرما آتا ہے تو بھی یہ بدستور اُگتی رہتی ہے مگر یہ اپنی روئیدگی سے اپنے ساتھی پودوں کا مذاق نہیں اُڑاتی۔ یہ اُن کی طرح سوکھ کر بے رنگ یا بے پات بھی نہیں ہوتی، بلکہ سدا ہری بھری رہتی ہے۔ اور سفید بالوں والے کہرے کو خوش آمدید کہنے کے لئے مزید تاباں اور شاداں ہستی بن جاتی ہے۔

سیّدہ حنا کا شعری مجموعہ

"عشق سے طبیعت نے"

وہ جو آگ تھی غم ہجر کی مرے جسم و جاں کو جلا گئی
میں ہزار بار جلوں تو کیا کبھی ایک بار جلے تو وہ

طباعت کے مرحلے میں

اکبر حمیدی کے تیسرے شعری مجموعے

"تلوار اُس کے ہاتھ"

کا انگریزی ترجمہ

THE DAY SHAL DAWN

کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے

مترجم :- پروفیسر جمیل آذر، حامد برگی، پروفیسر فرحت نواز

بُڑ پبلشر - ۱۸ ڈی جی ۷/۲ اسلام آباد

انتم پاٹھ

جوگندر پال

موٹر سائیکل کک لگتے ہی جھکاڑ جھنکاڑ کر دھواں چھوڑنے لگی اور وہ دونوں ابھی سیٹ پر جم کر بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ایک دم اچھل کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

پیچھے بیٹھا ہوا سنتا گھبرا کر کہنے لگا کہ چلنے سے پہلے بیٹھ تو لینے دیا کرو۔

"بیٹھ گیا سنتیا، تے پہنچے گا کس تراں؟"

سنتا اپنی پگڑی سنبھال رہا تھا، "کسے دی موت آجائے بنتیا، ننے یم بیٹھیاں بیٹھیاں ہی سدھا جا پہنچدا اے۔"

بنتا اسے ہنس ہنس کر بتانے لگا کہ سیدھا راستہ ہے، پو پھٹنے سے پہلے ہی جا پہنچیں گے۔

سنتے کی آنکھیں اچانک بنتے کے کندھے سے لٹکتی ہوئی اسٹین گن پر آ رکیں، جس کی نالی اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سراسیمہ سرعت سے اس کی گن کی بجائے گرتے گرتے اندر اپنی ہی کی پوزیشن بدل لی اور پھر بھی بنتے کی گن کو بدستور اپنی طرف اٹھتے ہوئے پا کر پریشان آواز سے پکار اٹھا کہ اس ماں کو میرے کلیجے کی طرف کیوں کیا ہوا ہے؟

بنتے نے اپنا دایاں ہاتھ موٹر سائیکل کے ہینڈل سے اٹھا کر گن کی نالی کا رخ اپنے آگے کی جانب موڑ لیا، "ڈرنا کیوں ایں، سنتیا؟ ماواں ڈائناں بھی ہون، ننے اپنی اولاد نوں نئیں کھاندیاں۔"

سنتا ڈھیلا ہو کر اسے بتانے لگا کہ ڈائنیں بے اولاد ہوتی ہیں، وہ مائیں ہوں تو ڈائنیں کیسے ہو سکتی ہیں؟ اس نے سن رکھا تھا کہ اس کی پیدائش پر یا تو اسے بچایا جا سکتا تھا یا اس کی ماں کو، اور اس کی ماں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر یہ فریاد کرتے ہوئے پران تیاگ دیئے تھے، میری پھکر مت کرو، کسی تراں میرے بچے نوں بچالو۔ اپنی ماں کی طرف دھیان جاتے ہی چھ فٹا سنتا جی ہی جی میں منا سا نکل آتا اور اپنے ننھے منے ہاتھ مار مار کے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگتا، یا پھر ماں کے ہاتھوں میں اچھل اچھل کر ہنسنے لگتا۔ نہیں وہ ماں کی شکل و صورت سے ناواقف تھا۔ کیسے واقف ہوتا؟ گھر میں اس کی کوئی تصویر ہی نہ تھی۔ وہ اپنے باپو سے سمجھنے کی کوشش کرتا مگر ہر بار باپو کے ایک الگ بیان سے اس کی ماں کی ایک نئی تصویر ہی ابھر کر آتی۔

"ہائے بابیو! تیریاں باتاں سُن کے بھالو ہر بار کوئی ہور مالوم ہُندی اے۔"

"تینوں کی دساں پُترا؟"، اس کا رنڈوا باپ اسے جواب دیتا کہ اس کی بھالو ایک عجیب شے تھی۔ جو عورت بھی سوچ لو، وہ ویسی ہی لگتی تھی۔

سو سُنتے سُنتے سنتے کو بھی ہر عورت اپنی ماں ہی معلوم ہونے لگی، یہاں تک کہ اپنی بیوی سے گلے ملتے ہوئے بھی کئی دفعہ وہ اس طرح بے اختیار رونے لگتا جیسے اپنی کھوئی ہوئی ماں کی چھاتیوں پر اپنا پھٹا ہوا منہ رکھے ہوئے ہو۔

گاڑی سیدھی سڑک پر سرپٹ دوڑی جا رہی تھی کہ بنتے نے اچانک آگے سے اپنے ساتھی کو صدا لگائی اور کوئی جواب نہ پاکر بے صبری سے اور اونچا بولا "اوے سنتیا!"۔

"ہاں ـــ آں ـــ ں!"

"سو گیا سی؟ پُتّے ہنے ایتھے کون رو رہیا سی؟"

"ہور کوئی نئیں، تے میں ہی رو رہیا ہوواں گا۔"

"پر توں تے سوں رہیا سیں سنتیا۔"

"تے کیا خواباں وچ رونے واسطے تیرے حکم دی ضرورت ہے؟"

بنتا چڑ سا گیا اور کہنے لگا کہ مجھے کیا؟ خوابوں میں رو رہا ہو یا ہوش میں۔ میں تو پوچھ رہا تھا کہ ابھی ابھی یہاں کون رو رہا تھا۔

اسی اثنا میں موٹر سائیکل نے ایک پٹاخہ چھوڑا اور سنتے کو لگا کہ اس کے کرتے کے اندر اسی کی گن آپ ہی آپ چل گئی ہے اور وہ اُچھل پڑا۔ "مینوں لگیا میری گن چل گئی اے"، وہ اپنی اُکھڑی ہوئی سانس پر قابو پانے لگا۔

"گناں اپنے آپ تھوڑا ہی چلدیاں نیں، مورکھا؟"

"کچھ وی کہہ اے مورکھا، چلدیاں او اپنے آپ ہی نیں۔"

سنتا ذرا رک گیا کہ اپنے ساتھی کو کس طرح سمجھائے اور پھر اس سے پوچھنے لگا کہ سچ سچ بتاؤ، کیا ہم اپنی مرضی سے گنیں چلانے نکل پڑے ہیں؟

"تو بڑا گہرا آدمی ایں، سنتیا"، بنتا اسے بتانے لگا۔ "ایسے لئی کسی کم دا نئیں۔ سدھی بات اے۔ جلاد حکم اُدولی کرے گا تے آپ خود پھانسی چڑھے گا۔"

"ہاں، بنتیا، ایسے لئی میں کہندا آں، توں میں کون، کے واہگورو دی مرضی نوں ٹال جائیے؟"، پریشان سا ہو کر حسب عادت وہ اپنی داڑھی کھجانے لگا اور گویا اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے کچھ یوں اضافہ کیا کہ اپنی گن کا منہ کھولتے ہوئے مجھے تو معلوم ہوتا ہے میری اپنی کوئی خواہش نہیں، مانو میری گن کی خواہش ہی میری خواہش بن گئی ہو۔

"تیرے بچے سلامت رہن۔" بنتے نے خوش ہو کر کہا۔
"تو مینوں سرخرو کر دتا اے۔ نئیں تے میں نے سمجھداساں، جتوں وی مارنا، میں ہی مارنا واں۔"
مگر اسے سن کر سنتے نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر ہماری بندوقوں نے ہمارے ہی بچوں کی طرف اپنے منہ پھیر لیئے تو۔ تو۔
"اے کس تراں ہو سکدا اے؟ بنتے نے بوکھلا کر موٹر سائیکل کی رفتار اور تیز کر لی۔ تو بڑا اوکھا آدمی ایں۔"
اوکھے آدمی نے جواب میں اتنا بلند قہقہہ لگایا کہ سڑک کی دونوں طرف تاریک درختوں کی شاخوں میں سوئے ہوتے پرندے اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔
قہقہہ لگا کر سنتا سبک ہو گیا اور بڑی شردھا سے جپ جی صاحب کی اٹھارہویں پاوڑی اونچے اونچے دہرانے لگا۔

"اسنکھ مورکھ اندھ گھور
اسنکھ چور حرام کھور
اسنکھ امر کر جاہ جور
اسنکھ گل وڈھ ہتیا کماہ۔"

"سنتیا،" بنتے نے نہ معلوم کیا کہنے کے لیئے منہ کھولا۔ لیکن اس خوف سے کہ گوربانی میں ٹوکنا پاپ ہے وہ ست نام سری واہگورو، کہہ کر چپ ہو گیا۔

"اسنکھ پاپی پاپ کر جاہ
اسنکھ کوڑیار کوڑے پھراہ
اسنکھ ملیچھ مل بھکھ کھاہ
اسنکھ نندک سر کرہ بھار
نانک نیچ کہے ویچار
واریا نہ جاوا ایک وار
جو تدھ بھاوے سائی بھلی کار
سدا سلامت نرنکار۔"

"ست نام سری واہگورو!"
"بنتیا، سچا بادشاہ سانوں ضرور بخش دے گا۔"

"پر اُسی کیتا کی اے، سنتیا؟"

سنتے کو بنتے پر ترس آنے لگا کہ بے چارہ اپنے دُکھ کو بھی نہیں سمجھ پا رہا۔ وہ دل ہی دل میں پرارتھنا کرنے لگا کہ سچا بادشاہ اُن دونوں کو بخش دے، کہ وہ بُرے کام تو ضرور کرتے ہیں، لیکن سچا بادشاہ تو جانتا ہی ہے کہ وہ بُرے آدمی نہیں۔ "تو تُسیں بھی جاندا، سچے پادشاہ، پھر وی بخش دے۔ تیری بخشش بے حساب ہے۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سر کو جھکا رہا تھا۔ کہ بنتے نے موٹر سائیکل کی رفتار اور تیز کر دی۔ اور وہ جھٹکا کھا کر گرنے سے بمشکل بچا۔ "ہو تُو مینوں لے ڈُبیں گا۔"

"نئیں، سنتیا، تیرے کرکے میں بھی کنارے جا لگاں گا۔"

سنتا سوچنے لگا کہ اس کا یار بنتا اوپر سے سنگھاڑے کی طرح کانٹے دار اور کالا ہے مگر اسے ذرا چھیل لیا جائے تو سنگھاڑے کی میٹھی اور چِٹی دودھ گری نکل آتی ہے جسے کھا لینے کے بعد بھی اس کا سواد منہ سے نہیں جاتا۔ اس کے بچپن کا بیشتر حصہ اپنی نانی کے گاؤں میں گزرا تھا۔ اس کی نانی اس کے سامنے سنگھاڑوں کا ڈھیر لگاتے رکھتی تھی۔ "کھا پُترا، خوب جی بھر کے کھا!" — نانی نے اسے بتایا تھا کہ اس کی ماں بھی سنگھاڑے کھا کھا کے کبھی نہ تھکتی تھی۔ "پُتر، کل تُو دُھپ وِچ بال کھول کے سنگھاڑے کھا رہیا سی، مینوں لگیا، ساکشات میری امر کور آ گئی اے۔" نانی نے اسے بے اختیار گلے لگا لیا تھا اور اسے یہ معصوم سا خیال گزرا تھا کہ کیا پتہ۔ ہاں، کیا پتہ، اسے جنم دیتے ہوئے، بھابو اسی لئے مری ہو کہ اُس کی جان اُس میں آ پڑے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو ہی ایک بھری پُری عورت کے رُوپ میں دیکھنے لگتا۔ "تو یہ ہے میری بھابو — بھابو — بھابو —" رات کو نانی اسے اپنی باہوں میں کس کر سوتی مانو بڑھیا کو ڈر ہو کہ وہ اپنے سپنے میں ہی کھیلتے کھیلتے کہیں نکل کر کھو جائے گا۔ حالانکہ سوتے ہوئے اس کی ساری کائنات اسی چارپائی پر سمٹ آتی ہوتی اور وہ آپ ہی آپ ماں بنے آپ ہی ماں کے ہاتھوں میں بے قابو ہو ہو کر اُچھل کُود کر رہا ہوتا، کھلکھلا کر ہنسے جا رہا ہوتا۔

"سنتیا! — اوئے سنتیا! —"

"ہاں — ں!"

"پھر سو گیا سیں۔" بنتا ہنسنے لگا۔ "ہنسے ہنسے ایتھے ہنس کون رہیا سی؟"

سنتے نے جواب دیا کہ اگر تُو نہیں ہنس رہا تھا، تو میں ہنس رہا ہوں گا۔ یہاں اور کون ہے؟

"نئیں سنتیا۔" وہ بڑی متانت سے اس سے پوچھنے لگا، "کی پتہ، کوئی چھلاوہ ساڈے پِچھے لگ گیا ہووے۔"

"چھلاوہ پِچھے نئیں لگدا۔" سنتا بنتے کو بتانے لگا۔

"لوگ ہی اس دے پِچھے لگ جاندے نیں۔" اسے حیرت تھی کہ ابھی یکارا ستہ ختم کیوں نہیں ہوا۔ اُنہیں ابھی

رستے پر ایک سیدھ میں چلتے جانا تھا جہاں چند ایک کوس پر گویا نارکول کے روڈ کے باطن سے ہی اسی سیدھ میں کچا راستہ شروع ہو جاتا تھا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ یہ کچا راستہ چند اور کوس پر سہج سہج ننگے پیروں ایک گاؤں میں جا نکلتا ہے۔ ان دونوں کو یہیں کے مزدار کے پورے کنبے کو اپنی سٹین گنوں کی گولیوں سے دھنادھن بھون دینا تھا۔ سنتا بننے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا مزدار غریب کا پتہ کاٹنا ضروری ہے۔ وہ اس کے سارے کنبے کا ملیامیٹ کرنے جا رہے ہیں، کیوں؟ ان بیچاروں نے اُن کا کیا بگاڑا ہے؟۔

اسی دوران اُن کی موٹر سائیکل ایک بوڑھے کتے کو روند کر گزر گئی۔

"سنبھل کے بنتیا، خواہ مخواہ بے زبانے دی جان لے لئی ؛"

"جان پیاری ساؤ، تے سڑک دے وچوں وچ رستہ روک کے کیوں کھڑا سی ؟"

سنتے کی سمجھ میں آنے لگا کہ یار مترا سے دور ہی سے دیکھ کر اِدھر اُدھر کیوں ہو جاتے ہیں۔ جانتے ہیں اسپیڈ میں اندھا دھند چلا آتا ہے۔ اس کا راستہ خالی ہی چھوڑ دو، جہاں جاتا ہے، جائے، ہمیں کیا؟۔ اور تو اور، اس کا جگری دوست وچنا بھی اب اس سے بھاگنے لگا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ روز کی کھائی پی اشیا تک کے بارے میں بھی اس طرح سر جوڑ کر باتیں کئے جاتے جیسے اپنے کوئی گہرے راز آگل کر انہیں بڑا چین آرہا ہو۔

"اوے وچنیا۔"

"ہاں، سنتیا۔"

"پتہ، پھر کی ہویا؟"

وچنے کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں "کی ہویا؟"

"پھر میں مکھناں دی لسی دے دو کڑے والے گلاس پی گیا۔"

"اچھا؟"

"ہاں، پھر وی جی نہ بھریا، تے میں تے چاچی دا حصہ وی چوری چوری پیٹ وچ روڑ دتا۔"

"اچھا؟" اس نے پوچھنا چاہا، پھر تو چاچی بھوکی رہ گئی ہوگی؟

"نئیں، چاچی چاچے دے ماں تے جو ہاتھ صاف کر لیندی اے۔"

"ہہ ہہ ہا ہہ ا ۔"

ان دونوں کے قہقہے اس طرح گھل مل جاتے جیسے دو کی بجائے کوئی ایک ہی قہقہا ئے جا رہا ہو۔

"ہائے، اینی دھپ وچ بدل کیوں گجن لگ پئے نیں" اس کی چاچی دوڑ کر آنگن میں آ نکلتی، "کدھرے میرے دانے نہ بھج جان۔" وہاں وہ ان دونوں کو قہہ قہہ کرتے ہوئے پاکر خفا ہو جاتی، "لینے زور نال ہسو گے غرک جانیو،

تے رستہ بھول جاؤ گے۔،،

وہ دونوں اور زور سے ہنس ہنس کر چاچی کو بتاتے کہ ہمیں کہیں جانا ہی نہیں، پھر راستہ کیسے بھولیں گے ؟

،،اوے پاگل دے پُت ۔،، بنتا بیٹھے بیٹھے اُچھلا اور سنتے سے پوچھنے لگا،،اک دم قہقہے کیوں مارن لگ پیاں ؟،، اور پھر سنتے کا کوئی جواب سُنے بغیر اس نے بھی قہقہانا شروع کر دیا اور سوچنے لگا کہ کچھ بھی کہہ لیں، اصل مزہ تو بے وجہ ٹھا ٹھا سے ہی آتا ہے ۔

سلیم آغا قزلباش

ساحل احمد

انوار فیروز

سہیل اختر

اکبر حمیدی

کوئی راکش ای - اوداای تیرا یار سنتا واں یار! تھوڑا بھل بھٹک گیاں تے پیار نال راہ تے ڈال دے ——— پر توُ ٹھیک کہنداں بنتیا، ایس فانی سنسار وچ کوئی کسے دا نئیں۔" موٹر سائیکل کسی گڑھے میں سے گزری تو وہ سنبھل کر اپنی پگڑی سنبھالنے لگا۔ توُ بھی تے کوئی غیر نہیں، بنتیا، توُ ہی کوئی راہ لبھ دے، دیرا،،۔

" راہ تے لبھ پئی اے شیرا،، بنتے نے اُسے بڑی مسرور آواز میں بتایا کہ آگے کا کچا راستہ چند ہی گز پر شروع ہو رہا ہے۔

سنتا بھی سب کچھ فراموش کر کے خوش ہو گیا کہ چلو، راہ تو ملی۔ اُس کے عہدِ طفلی میں اس کا باپ اکثر دیر سے گھر آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ دوسرے دن گجردم تک بھی گھر نہ لوٹا تو سنتا رونے لگا۔ اس کی نانی اسے کلیجے سے لگا کر سمجھانے لگی، روتے کیوں ہو؟ تمہارا پیو راستہ بھول گیا ہو گا۔ آؤ، ہاتھ جوڑ کر سچے بادشاہ کے حضور میں کھڑے ہو جاؤ اور پرارتھنا کرو کہ وہ تمہارے باپ کو گھر کی راہ پر لگا دے۔ نانی اسے پاس بٹھا کر اکثر گھنٹوں سمجھایا کرتی کہ ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرو، سیدھا راستہ سیدھا بیکنٹھ کو جاتا ہے۔

" سِدھا رستہ سِدھا بیکنٹھ نوں جاندا اے بنتیا۔،، اس نے نانی کے لہجے میں اپنے ساتھی کو بتایا۔

" ہاں، تیار ہو جا شیرا۔ لمبر دار دے سارے کُنبے نوں اساں اودھر ہی دھکنیا اے۔،،

مگر بیکنٹھ کے تصور پر سنتا تو اپنی ماں کے پاس جا پہنچا تھا، جو سچے بادشاہ کے محلوں میں اس کے جھوٹے برتنوں کا ایک بہت بڑا انبار مانجھے جا رہی تھی۔ سنتے کو سچے بادشاہ پر غصہ آ رہا تھا کہ ہر روز خواہ مخواہ دیویوں دیوتاؤں کا لنگر کھولے رکھتا ہے۔

" نئیں، پُتر بنتیا، ایسا بولنا پاپ اے۔ میرے تے دھنیہ بھاگ نیں کہ مہا پرکھاں دے جھوٹے برتن چمکانے دا کم کرنی آں۔،،

" پر بھابو —،،

" نئیں، بھابو دے پُترا، برتن بھانڈے نہ چمکن تے ٹھکیا دی ٹھکھ مر جاندی اے۔،،

سنتا اپنی مرحوم ماں کے ساتھ جُڑ کر بیٹھا تھا اور بالکل جُڑ کر بھی اس کی طرف اور سرکتا جا رہا ہے اور سرکتے سرکتے اُس کے عین دل میں آ داخل ہوا ہے اور یہاں سے وہ اپنی ماں کی کوکھ میں اُتر گیا ہے اور کوکھ سے جنم لیتے ہوئے رونے لگا ہے۔

" سنتیا! — اوئے سنتیا! —،،

" ہاں — آں — !،،

" ہُنے ہُنے ایتھے ہو کون رہیا سی؟،،

مگر سنتا تو ابھی تک بلکے جا رہا تھا، کیونکہ پیدا ہوتے ہی اس کی ماں مر گئی تھی۔

آس پاس کے جنگل میں چھپی ہوئی پو اب اپنے تجسس پر قابو نہ پا کر درختوں کے عقب سے باہر نکل آئی تھی اور ان کے ارادوں کو بھانپ کر اِن کی موٹر سائیکل کے آگے آگے دوڑنے لگی تھی کہ ان سے پہلے گاؤں میں داخل ہو کر نمبردار کو خبردار کر دے۔ موٹر سائیکل اتنی تیز رفتار پکڑے ہوئے تھی کہ لگتا تھا جیسے سواروں کو کہیں پہنچنا نہیں ہے، وہ بس پو کا پیچھا کرنے کے لئے بے تحاشا بھاگے جا رہے ہیں۔

"بنتیا!" پیچھے پیر بھاگتی ہوئی گاڑی بہت گرد اڑانے لگی تھی اس لئے سنتا اپنی پگڑی کا لانگ منہ کی طرف لے جانے کے لئے ذرا رک گیا۔ "نمبردار نے ساڈھا کی بگاڑیا اے؟"

"او اوے سنیا، او، وچارہ ساڈھا بگاڑ بھی کی سکدا اے؟" مگر سنتے کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ نمبردار کا صفایا کرنے کیوں جا رہے ہیں؟ "نئیں بنتیا، ذرا غور کرو۔"

"تو غور بہت کرنا ایں، ایسے کر کے تیرے کولوں کج وی نئیں ہندا۔" بنتے کو اپنے سامنے صبح کے چند سفید پنچھی اڑتے ہوئے دکھائی دیئے تو اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے موٹر سائیکل تھام کر دائیں سے گن ہاتھ میں لے لی "ڈز۔ ڈھا۔ دھم۔ م۔ م!۔"

دیکھتے ہی دیکھتے کئی پنچھی ایک ساتھ تڑپتے ہوئے نیچے آ گرے اور موٹر سائیکل بدستور گرد اڑاتی ہوئی آگے ہی آگے دوڑتی چلی گئی۔

"اینہاں نوں کیوں گرایا ای، بنتیا؟"

بنتے نے فاتحانہ قہقہوں کے درمیان اسے بتایا کہ بس، ذرا نشانہ بنانے کے لئے، اور کس لئے؟

"نئیں، ذرا سمجھ کے جواب دے۔"

بنتا اسے متنبہ کرنا چاہتا تھا کہ زیادہ سمجھ والے ہی سب سے پہلے نشانے کی زد میں آتے ہیں۔ اس نے سر موڑ کر اس سے اپنی بات کہنا چاہی لیکن موٹر سائیکل کی نہایت تیز رفتار کے باعث آگے ہی دیکھتا رہا۔ "اے نمبردار بھی تیری طراں بڑا سمجھدار سی، بنتیا، ایسے لئی تو اونوں گولی نال اڑان جا رہیاں ہاں۔"

مگر سنتا سوچ رہا تھا کہ نمبردار اس کے نانے جیسا گوردو کا نیک سکھ ہے۔ اتنا سچا پرش ہے کہ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو جی چاہتا ہے۔ بس اس کا قصور یہی ہے کہ اپنے سارے کام چھوڑ کے بگڑے ہوؤں کو سمجھاتا رہتا ہے۔ اس کا نانا اور نانی بھی تو ہر وقت اسے سمجھایا کرتے تھے، سبھوں کو بڑے چاؤ سے سمجھاتے تھے ان کے راستے سے گزر کر کسی کو گویا چھلنی سے نکلنے کا احساس ہوتا جیسے اس کا سارا کھوٹ چھن کر الگ ہو گیا ہو، ان کی باتیں سن سن کر میں نے تو لڑکپن میں ہی گھیر دے کپڑے پہننے کا فیصلہ کر لیا تھا، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو کیا میں انہیں

بھی اپنی گولیوں سے مجھُون دیتا ؟

" نہیں بنتیا، چل مُڑ جائیے۔ میں لمبردار تے ہتھ نہیں اُٹھا سکدا۔"

" کوئی فکر نہیں مور کھا "، بنتے نے ہنس کر کہا : "تو ایدھر اودھر ویکھن لئی کھڑا ریئیں۔ میں آپی کلا اے کم کر لاں گا۔ ہر چیز تے لوک نیں، لمبردار، اودی جنانی، پُت، نوُں، پوتی۔ بس !۔"

سُنتے نے اسے یاد کروایا کہ لمبردار کی بہو کے پیٹ میں بھی تو ایک جیو پل رہا ہے۔

" اونوں چھڈ، او آپے اپنی ماں دے پیٹ وچ رہ رہ کے مر جائے گا۔"

" دھرم نال، توُ بڑا ظالم اے، بنتیا۔"

" اسی ظالم کیوں ؟ آسی تے رب دی اِچھا دا پالن کر رہے آں۔"

سُنتے نے جب بنتے سے پوچھا، وہ کیسے ؟ تو بنتے نے اُسے بتایا، ایسے کہ جو سارے ٹولے کی اچھا، وہی رب کی اِچھا۔ اِس پر سُنتے نے اعتراض کیا کہ رب تو سب کا رکھا ہے۔ وہ کسی کو مارنے کی اِچھا کیسے کر سکتا ہے ؟ بنتا جھلا گیا اور بولا کہ اب اپنا کیرتن بند کرو اور چُپ چاپ مکھیوں کے آرڈر پر عمل کرو۔ نہیں تو تم جانتے ہی ہو کیا حشر ہوگا؟ سُنتا واقعی ڈر سا گیا، مگر کچھ اس طرح اسے معلوم بھی نہ ہُوا کہ وہ ڈر گیا ہے، ورنہ وہ اپنے آپ کو ڈانٹ ڈپٹ کر سیدھا کر لیتا۔ تھوڑی دیر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اسی اثنا میں ان کی موٹر سائیکل فرّاٹے بھرتی ہُوئی ایک گوردوارے کے سامنے سے گذری جو نمبردار کے گاؤں سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھا۔ گوردوارے سے اس بھجن کے بول سنائی دے رہے تھے ــــ مِٹی دُھند جگ چانن ہویا ــــ مِٹی دُھند جگ چانن ہویا ــــ اپنے اُس پاس دھیمے دھیمے چانن میں سُنتے کو اچانک نامعلوم کیا نظر آ گیا کہ وہ پھر تن کر بیٹھ گیا اور بنتے کو مخاطب کر کے اسے صاف صاف بتانے لگا کہ نمبردار کا بال بھی بانکا نہ ہونے دے گا۔

بنتے کے کان لمبے ہو کر سُنتے کی داڑھی کو چھونے لگے۔ اور اس نے اب کے بڑی غصیلی آواز میں جواب دیا۔

" سُن او جنانیا، اپنی بکواس بند کر، نہیں تے لمبردار توں پہلوں مینوں تیرا صفایا کرنا پے جائے گا۔"

بنتے کی سخت کلامی سے سُنتے کا پارہ یک لخت اس قدر چڑھ آیا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا، اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس اپنی گن نکال کر پیچھے سے بنتے پر فائر کر دیا اور وہ دونوں اُڑتی ہُوئی گاڑی پر ہی گتھم گتھا ہو کر نیچے زمین پر آ گرے اور انھیں اپنی اپنی جگہ پر ہلنے سے قاصر پا کر عین اس وقت ایک بندر کسی درخت سے نیچے اُترا، اور ان کی بندوقوں کو کچے راستے سے اُٹھا کر بھوت پریت کے مانند نہایت سُبک قدموں سے کنارے کے گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

" نہیں، بنتیا، نہیں !۔"

سُنتا اپنی ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کو اپنے ساتھی کی طرف گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب بھی اسے سمجھانا چاہ رہا تھا کہ وہ سیدھا راستہ اختیار نہیں کئے ہوئے تھے۔ رب تو اک ہی رب ہے بنتیا، اک ہی سب سے بڑا رب، ساری دُنیا دا رب، بنتیا ــ نہیں، بول نہیں، بس غور کر ا۔

اور جب غور کرتے کرتے بنتے کے دموں کا تار ٹوٹنے لگا تو سُنتے نے بڑی مشکل سے اپنی اُکھڑی ہوئی سانسوں کو سمیٹ کر اس کے کانوں میں یہ بات اُتاری ۔

بنتیا، بھتیاں رباں نے آدم جات نوں بیٹھی راہیں ڈال دِتا اے ۔

بقیہ ”اندھیری رات کا تنہا مسافر“

ہے ۔اس کے علاوہ زبان اور بیان بھی کافی رواں ہے ۔ علاوہ ازیں انہوں نے اس ناول میں اپنے ہر کردار کو بہت مناسب جگہ دی ہے اور اُسے آخر تک عمدگی سے نبھایا ہے ۔

بقول خود مصنف کے ”میں نے یہ ناول تجربے کے طور پر لکھا ہے“، مجموعی طور پر ناول کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا یہ پہلا تجربہ کامیاب رہا ہے اور اس لحاظ سے بھی وہ قابلِ ستائش ہیں کہ انہوں نے اس مشکل اور نازک لیکن اہم موضوع پر قلم اُٹھایا اور پڑھنے والوں کے دلوں میں جہاں افسردگی کے جذبات پیدا کئے وہاں انہیں کچھ سوچنے پر بھی مجبور کیا ہے ۔ ناول کا اختتام بھی انہوں نے عام ناولوں سے ہٹ کر کیا ہے ۔ اور اسی اختتام کی بدولت یہ ناول قاری کے دل و دماغ سے نہیں نکل پاتا، بلکہ ذہن و دل پر چھایا رہتا ہے ۔ اور وہ اس مسئلے پر سوچنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے ۔

ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے شہزاد منظر کو قابلِ مبارکباد کہا جا سکتا ہے ۔ ساتھ ہی ہمیں ان کے اگلے ناول کا بھی انتظار بڑی شدت سے رہے گا جس کے لئے انہوں نے خود یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ ”میں ایک بڑا ناول لکھنا چاہتا ہوں جو اُردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہے“۔ ہمارا خیال ہے کہ اپنے وسیع تجربے، ادب سے خلوص اور لگن کی بنا پر وہ یہ کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں ۔

یوں بھی ؏

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول

گیا تھا۔ دوسری کار سے مخدوم نکلا تھا۔ اور اس کا شوفر کسی خاص اشارہ کی بدولت اندر ہی بیٹھا رہا تھا۔

"ہیلو۔ !" مسکراہٹ سرخ ہونٹوں سے پھسل کر مخدوم کی آنکھوں کا نشہ بن گئی تھی۔

"دیکھا! تم نے بھی نگہت لتیف کو دیکھ لیا ہے نا۔ !"

"نگہت قادر کہو۔"

"نہیں۔ مسز قادر بھی تھی۔ پھر یہ بیگم لتیف بنی۔ اور اب۔ تم اسے کل پرسوں نگہت زمان کے روپ میں دیکھ لوگے"

"کیا یہ بیگم شفیقہ پر ظلم نہیں ہے! سمجھ میں نہیں آرہا۔ نگہت کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ پتہ پھینکنے میں یہ کتنی ماہر بن چکی ہے۔"

"ہاں کمال کی فنکارہ ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تمہارے مسٹر فرخ اس کے حملہ سے بچ گئے تھے۔"

"فرخ کی بات مت کرو۔ ایسا دل پھینک آدمی قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ میں تو صرف اس لئے نبھا رہی ہوں کہ ہماری کمپنی میں اس کے شیئرز زیادہ ہیں۔ ورنہ۔۔ !۔۔"

"اوہ یاد آگیا۔ میری مسز بھی آج کل بڑے پُرپُرزے نکال رہی ہے۔ پرسوں مجھے تم سے میکملن کی پارٹی میں، محوِ گفتگو دیکھ کر اُسے تو آگ لگ گئی تھی۔ رات دیر تک بحث ہوتی رہی تھی۔ میں نے بھی تنگ آکر کہہ دیا تھا کہ ہاں، اسے سچ ہی سمجھو۔ میں شائستہ کو بے حد پسند کرتا ہوں۔"

"سچ !۔" وفورِ مسرت سے اس نے مخدوم کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا تھا۔ "سچ کہہ رہے ہو! آؤ۔ اندر چلیں۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ ہمیں کس تقریب میں مدعو کیا گیا ہے۔ میں تو تمہارے الفاظ کی جادوگری سے خود کو بھی فراموش کر بیٹھی ہوں۔"

ایک اور کار نے نیم دائرہ میں گھوم کر قطار میں جگہ بنالی تھی۔ فائزہ نے باہر نکل کر قہر آلود نظروں سے دونوں کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اور مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ "نہیں! میں اسے مزا چکھا کر ہی رہوں گی۔ ابھی تو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔ شمیتی نے میرے بھائی کو اپنی محبت کا یقین دلا کر اسے ہمارے خاندان کا باغی بنا دیا تھا۔ میں تو کم از کم اس کا مخدوم کے ساتھ اندر داخل ہونا قطعی پسند نہیں کرتی۔ اب مخدوم کی شرارت بھی سمجھ میں آنے لگی ہے۔ کتنا سادہ اور بھولا بن کر ہمارے حلقہ میں داخل ہوا تھا۔ وہ تو خود ہی اس نے افواہ پھیلا دی تھی، کہ یہ شمیتی کو اپنے دل کی ملکہ بنا بیٹھا ہے۔ اس وقت شمیتی نے بھی بڑی خجالت محسوس کی تھی۔ مگر بعد میں جب شمیتی کو اس کی محبت کا یقین ہوگیا تھا، اور اس کا جھکاؤ بھی اس کی طرف والہانہ طور پر ہونے لگا تھا۔ تو فراست نے بھانڈا پھوڑ دیا تھا، کہ مخدوم تو ایک عدد بیچی کا باپ ہے۔ اور آدھی سے زیادہ زمین جو ہمیں ہار کر اور اپنی شکست کا بدلہ لینے کی خاطر مالدار خواتین کو بے وقوف بنانے کا فن سیکھ رہا ہے، یہ مخدوم کا بچہ! اس حقیقت کو ابھی تک

جھٹلا رہا ہے۔ اور، فراست سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور اب۔ شیتی۔!۔ نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" . . . . . . ایک اور کار، روشنی کے دائرے بناتی فائزہ کے قریب ہی رک گئی تھی۔ "ہیلو!"

. . . . فائزہ چونک سی پڑی تھی۔ اس کے لب ہلے لیکن آواز حلق میں دب کر رہ گئی۔ کار سے اُتر کر بیگم توقیر نے کندھے سے کھسکتی ہوئی شال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "ہیلو! فائزہ۔ بھئی کمال ہے، پہچاننا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"اوہ۔ بیگم صاحبہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو بس۔ اس جگہ آپ کی موجودگی سے حیران رہ گئی ہوں۔"

"کیوں؟۔ یعنی!۔ کیا میں تم لوگوں کے سرد جذبات میں شعلے حلول کرنے کی خاطر اس طرف نہیں آسکتی۔!" فائزہ خجالت سی محسوس کرنے لگی تھی . . . . .

"دیکھو بیٹی!" بیگم توقیر بولی۔ "بیوگان کی امداد کے لئے قائم ٹرسٹ کو مالی طور پر ابھی بہت زیادہ مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔ یہاں پر نت نئی تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ آج بھی حقوقِ نسواں کے سلسلہ میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ میں مدعو تو نہیں ہوں۔ مگر۔ دیکھنا یہ ہے کہ حقوقِ نسواں، کی حامی خواتین عملی طور پر کیا قدم اُٹھانے کا عہد کرتی ہیں۔ اور پھر۔ صرف تقریروں پر ٹرخانے والی ہستیوں سے ایسے موقع پر چندہ حاصل کرنے کے لئے آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیوں!۔ سمجھ میں آگئی میری بات!"۔ اسی دوران ایک سوزوکی وین رُکی تھی۔ اس میں سوار دس جوان لڑکیوں نے پہلے اپنی ہنسی سے، پھر قہقہوں سے ٹھٹھری ہوئی فضا کو مزید بوجھل بنا دیا تھا۔ فائزہ نے خلاصی کرانے کی خاطر موضوع بدلا۔

"دیکھئے۔ معزز خاتون۔ پُرانی نسل کی فرسودگی سے اُکتائے ہوئے لوگ!۔ یہ قدامت پرستوں کی نفرتوں کی بدولت بغاوت کا پرچم لہرانے والی نسل، اب کچھ نہ کچھ کر کے رہے گی۔ آج، یہاں، . . . "جوان نسل کا باغیانہ رقص" کا خصوصی پروگرام ہے۔ آپ بھی دیکھنا پسند فرمائیں گی؟"۔ وہ لمبے لمبے قدم اُٹھانے لگی تھی . . . . نئی نسل کے . . . اندر داخل ہو جانے پر۔ ایک لمبی کار بیگم توقیر کے قریب آکر رُکی۔ ایک ادھیڑ عمر خوش پوش آدمی نے باہر نکل کر پہلے تو بیگم توقیر کا بھرپور جائزہ لیا۔ پھر منہ چڑایا۔ اور گردن اکڑاتے ہوئے قدم اُٹھانے لگا۔ "سیٹھ کفیل!" بیگم توقیر نے گہرا ٹوٹا ہوا سانس بھر کر دبی آواز میں کہا۔ "تمہارا ظاہر اور باطن مجھ پر پوری طرح عیاں ہے۔ تم ستم زدہ اور ظلم رسیدہ خاندانوں کی حسین کنواری لڑکیوں کو ملازمت اور اچھے رشتے دلانے کا لالچ دے کر غیر ممالک بھیجتے ہو اور پھر لاکھوں ڈالر اور پونڈ کما کر سمجھتے ہو، کہ تم جیسا کامیاب کاروباری اور کوئی نہیں ہے۔ مگر تم کو شاید معلوم نہیں ہے کہ تمہاری طلاق یافتہ بڑی بیٹی نے سمگلنگ کے الزام میں گرفتار ہو کر، تمہارا راز فاش کر دیا ہے۔ میں ابھی جس معزز ہستی سے چندہ وصول کر کے آرہی ہوں اُسے آج ہی یہ اطلاع ملی ہے، اور تمہارے گرد پولیس کا حلقہ تنگ ہونے لگا ہے۔ آخر کب تک؟" اور بیگم توقیر کے آگے قدم اُٹھانے کے ساتھ ہی ایک چیخ فضا میں کپکپا کر رہ گئی تھی

"سُوَر۔ حرامی۔ کمینے!۔"

سب کی نظریں بڑے گیٹ کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک نوجوان بے حد حسین لڑکی۔ جس کا عنابی رنگ کا گاؤن شانے پھٹ چکا تھا، گالیاں دیتی اندر داخل ہو گئی۔ اور اس سے پہلے کہ اس کے تعاقب میں دوڑنے والے دو نوجوان اس تک پہنچیں، ایک بوڑھا شوفر بھاگ کر لڑکی اور لڑکوں کے درمیان آگیا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"خدا کے لئے۔ میری چندا کو کچھ نہ کہو۔ اس کا قصور معاف کر دو۔ یہ نادان ہے، بے وقوف ہے۔" ایک ہاتھ اُٹھا، اور طمانچے کی آواز نے بیگم توقیر کو لرزا دیا۔ دوسرے نوجوان نے چندا کو کندھے پر اُٹھا کر کہا۔ "بوڑھے۔ زندگی کی خیر چاہتے ہو، تو اسے بھول جاؤ۔ تم گھوڑ دوڑ کے رموز کو کیا جانو۔ . . . باہر بیٹھ کر ریس کورس کے اندر کی سرگرمیوں پر کڑھنا ہی تمہارا مقدر ہے۔"

دونوں تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ ان کی گرفت میں چندا کا مچھلی کی طرح تڑپنے کا منظر بوڑھے کو سِل پتھر بنا گیا تھا۔ ایک دوسرے شوفر نے قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"چچا نظام، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تمہاری چندا کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کا اس ماحول سے، اس پرواز سے کیا تعلق؟" اور نظام یوں رو پڑا تھا جیسے سیلاب کا پانی کچی دیوار کو پہلی ہی ٹکر میں گرا دے۔

"وہی ہے۔ ہاں۔ کیا میں اپنی اولاد کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اور اس کے ساتھ۔ ایک لڑکا تو میرے مالک کا ہے۔ اور دوسرا، جس نے طمانچہ مارا ہے، شاید، وہ میرا ہی کوئی رشتہ دار ہو!"۔ بیگم توقیر انگلیوں کی پوروں میں اپنے آنسو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے قریب آگئی۔ "یہ نتیجہ ہے خود کو اپنے سے برتر لوگوں کی برابری کے جنون میں مبتلا کرنے کا۔ تم اس وقت خاموش رہے ہو گے جب چندا کوٹھی میں جا کر وہاں کی خواتین کے میک اپ کا سامان چرا کر لاتی ہو گی۔ پھر اس وقت بھی تم نے اسے کچھ نہ کہا ہو گا جب اس کی خوبصورتی کی وجہ سے کوٹھی میں رہنے والوں نے اسے سنوارنا شروع کر دیا ہو گا۔ اور جب یہ ان لوگوں کے رنگ میں خود کو رنگ کر ان کی شہ پر جذباتی اداکاری کرنے لگی ہو گی۔ تو تم نے اس وقت بھی نظروں کے زاویے بدل لئے ہوں گے۔ اور اب ۔۔۔۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔ اب یہ چندا، تمہاری چندا نہیں رہی۔ ہاں۔ جب یہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جائے گی۔ یا رقابت کی وجہ سے زخمی کر دی جائے گی، تو اس وقت یہ لوگ اس سے لاعلم ہو جائیں گے۔ سارے تعلقات ختم کر دیں گے۔ اور ماتم کرنے کے لئے تم سامنے آجاؤ گے۔ خدا تم پر رحم فرمائے۔" اس کی آواز دیر تک فضا میں سسکتی رہی تھی۔

بے مہر رات کا دروازہ

غلام دستگیر ربانی

اُس رات بھی وہ بڑی دیر سے گھر لوٹا۔

سارے دن کے عذاب بھرے لمحوں کی آوازوں کے بَین اب تک اُس کے کانوں، آنکھوں اور ہونٹوں کے گرد منڈلا رہے تھے۔ کانوں میں کرب کی آوازیں پلٹ آتی تھیں کہ یک دم باپ کی زبان کا کوڑا اس کی گردن پر پڑتا ہے۔

تُو نے — کفر اور الحاد کی سبھی حدیں پھلانگ لیں۔ اخلاقیات کی اور سماج کی تمام سیڑھیاں طے کر لیں۔ اب مجھے ڈر ہے کہ تو اُس گھر کو نگل جائے گا —— وہ پھٹی آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھتا ہے اور گونگے پن اور بے بسی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ کوئی نئی چال ہے۔ کوئی نیا دھوکا ہے اس کے لئے اس کے وجود کو جھنجوڑنے کے لئے کوئی برقی جھٹکا۔ اور وہ خونخوار بِلّے کے سامنے ایک معصوم کبوتر بن جاتا ہے۔

غڑغوں۔ غڑغوں —

ایک بہانہ۔ دوسرا بہانہ اور اندھیرے میں اُٹھ کر اُس کی طرف آنے کے بجائے باورچی خانے کی طرف جاتا ہوا وجود۔ جس کے چہرے اور ہاتھوں کی جھرّیوں میں ممتا تڑپی ہے۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" وہ اس زہر کو تھوکنے کی کوشش کرتا ہے جو کہ باپ کی باتوں نے پیدا کر دیا ہے اور اپنے اندھیرے کمرے کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

"تو منہ ہاتھ دھولے میں کھانا لگاتی ہوں۔"

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ سو جائیں۔"

مجھے کیسے نیند آئے گی بیٹا۔ تین دفعہ تو تمہارے ابا کو باہر بھجوا چکی ہوں کہ اردگرد سے پوچھ کے آئیں۔ بوڑھے وجود آخر کب تک صبر کریں آخر ہم نے کھانا کھا ہی لیا۔

آپ میرا کیوں انتظار کرتے ہیں جبکہ آپ کو علم ہے کہ . . . . " وہ کہتے کہتے رُک گیا اور اپنے کمرے کی روشنی جلا لی۔

"لو صاحب کا دن چڑھ گیا۔" دوسرے کمرے سے زن کر کے آواز کا پتھر اس کی چھاتی پر لگا۔ کب کھانا کھائے گا اور کب سو کر اُٹھے گا۔ ایک اور تیر — جانے کمرے میں کیا کرتا رہتا ہے۔ کچھ بتاتے بھی تو۔"

وہی خامشی۔ مزاروں جیسی لیکن تیروں سے سینہ چھلنی۔ جی چاہتا ہے کہ دروازہ پوری طاقت سے پیٹ کر باہر نکل جائے اور پھر کبھی واپس نہ آئے مگر گھر سے باہر تو خوف کے کتے قطار اندر قطار منہ کھولے کھڑے ہیں۔ اور بھوک —

"لو کھانا کھالو۔ میں نے تیسری مرتبہ گرم کیا ہے۔"

"ماں تم سو جاؤ۔ مجھے بھوک لگی تو میں کھالوں گا۔"

بیٹا۔ تم ہمارا امتحان مت لو۔ ہم ناتوانوں کے زخمی جذبوں کو اپنی جوانی کے بے لگام سُموں تلے مت روندو۔ اس طرح تم اپنی زندگی بھی برباد کر ڈالو گے۔"

وہ نصیحتوں کی گٹھڑی میں باندھ دیا گیا ہے۔ اور ابھی رات ہے۔ ایک لمبی اور بے جان رات اُس کے سامنے پڑا کھانا چوتھی مرتبہ ٹھنڈا ہوا ہے۔ اور اُس کے اندر اپنی ماں اور باپ کے خلاف زہر قطرہ قطرہ جمع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ رات ایسی ہے کہ زہر حرفوں کی صورت باہر نکلنے کو بے قرار ہے مگر لمحہ ایسا کہ حرف جس میں لبوں سے نکلیں تو برف بن کر — اُس کی کہانی میں رات کے دو بج چکے تھے۔

اور اس کے اندر اپنے وجود کی تلاش جاری تھی۔ اس نے سوچا۔ دو پنجر وجودوں کے درمیان وہ قید ہو گیا ہے اور اس کی شخصیت کہیں دب گئی ہے۔ اس کے ماہ و سال گھر کے شگافوں اور درزوں کو بھرنے میں لگ گئے ہیں اور ابھی تک ہر چھت ہر دیوار میں چھید ہے۔ کاش میں اس گھر میں اس بستی اور اس شہر میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ میری مٹی میرا وجود کسی اور ساخت کا ہوتا اور میں یوں بکھرا بکھرا نظر نہ آتا۔

وہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیتا ہے اور روشنی کی آنکھ کانی ہو جاتی ہے۔ بستر پہ پڑے پڑے سویر ہو گئی ہے اور وہ ابھی تک جاگ رہا ہے۔ اُس کے باپ نے اُسے قصداً نہیں جگایا اور اپنی عبادت میں مشغول رہا۔ ماں اپنے معمول کے کاموں سے فارغ ہو کر بیٹے کو جگانے آئی مگر ہمت نہ پڑی۔ دن کے دس بج گئے اس نے دروازہ اندر سے نہ کھولا۔

"جگا دو۔ اپنے لاڈلے کو۔ یا یونہی سویا رہے گا۔" باپ نے کہا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

ماں نے پہلے اُسے آہستہ سے آواز دی۔ پھر ہلکی دستک۔ پھر زور زور سے دستکیں۔ مگر وہ ساری رات کھلی آنکھوں سے سویا رہا۔ اور دستکوں کی آواز جیسے کوئی لوریاں دے کر اُسے پھر سے سلا رہا ہو۔

وہ اخبار سے نظریں ہٹا کر بیوی کو گھورتا ہے اور پھر دروازے کی جانب دیکھتا ہے۔ نہیں کھولتا تو دفع کرو۔

ڈاکٹر عبدالواسع کی تنقید

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر عبدالواسع سے میرا اوّلیں تعارف ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ ہُوا تھا۔ لیکن میں اسے کسی مصنّف کا باضابطہ تعارف تصوّر نہیں کرتا۔ اس بات کا اجمال یہ ہے کہ مجھے اُردو سوانح نگاری کے موضوع پر ایک مضمون لکھنا تھا اور اس مضمون کی تیاری کے لئے میں چند انگریزی کُتب، ڈاکٹر شاہ علی اور الطاف فاطمہ کی تالیفات کے علاوہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا اس موضوع پر وہ مقالہ بھی دیکھ چکا تھا جو انہوں نے مشفق خواجہ کے ایم اے کے تھیسس کی اساس پر لکھا تھا اور اس موضوع کے جملہ گوشوں کو منوّر کر دیا تھا۔ یہ سب حوالے دسترس میں آ گئے اور میں نے اپنے مقالے کا خاکہ ذہن میں تیار کر لیا تو ایک دوست نے بتایا کہ "فنِ سوانح نگاری" کے موضوع پر ایک کتاب ہندوستان سے ڈاکٹر عبدالواسع نے لکھی ہے۔ اسے ضرور دیکھ لیجئے۔ میں نے عرض کیا کہ انہوں نے اُردو سوانح نگاری کے آغاز و ارتقا کی داستان صرف صوبہ بہار کے محیط میں لکھی ہے اور میں موضوع کو فنّی حدود میں رکھنے کا آرزومند ہوں۔ کسی مخصوص خطّے میں سوانح نگاری کے رُجحانات کا تجزیہ فی الحال پیشِ نظر نہیں ہے۔ میرے یہ دوست میری کم علمی پر مسکرائے لیکن تبسّم زیرِ لب ہی رہا اور قہقہے میں منتقل نہ ہو سکا۔ بولے "انور سدید صاحب! یہ ان کی نئی کتاب ہے اور "بہار میں اُردو سوانح نگاری کا آغاز و ارتقا" سے الگ تصنیف ہے۔" انہوں نے مزید فرمایا کہ "اس کتاب میں انہوں نے اُردو سوانح نگاری کے فن ہی سے بحث کی ہے۔" ان کا یہ انکشاف میرے ارادے کے لئے گرفِ انہدام ثابت ہُوا اور میں اس موضوع پر کام نہ کر سکا۔ درحقیقت میرے پیشِ نظر یہ خیال تھا کہ جب ڈاکٹر عبدالواسع اس موضوع پر کام کر چکے ہیں تو اسے مزید کھنگالنے کی فی الحال کیا ضرورت ہے؟ کچھ عرصے کے بعد جب مجھے یہ کتاب دیکھنے کا موقعہ ملا تو میں ڈاکٹر صاحب کی محنت سے مرعوب ہُوا۔ ان کی کشادہ نظری نے متاثر کیا اور موضوع سے ان کی محبّت نے میرے دل پر ان کا نام نقش کر دیا۔ چنانچہ میں "فنِ سوانح نگاری" کو ایک ایسی کتاب تصوّر کرتا ہوں جس میں اس موضوع پر غیر جانبداری سے کام کیا گیا ہے اور اس کے متعدّد گوشوں کو ایک نئے دائرہ نور میں لانے کی کاوش کی گئی ہے۔ پاکستان میں تو یہ کتاب اب بھی نایاب ہے۔ لیکن میں جب احوال و آثار

خود ہی جب بھوک لگے گی تو دروازہ کھولے گا۔

،، مگر ۔ اُس نے پھر بھی دروازہ نہ کھولا تو ،،۔ وہ پریشان ہو کر کہتی ہے۔ اور کچھ زیادہ بوڑھی لگنے لگتی ہے۔

تم ماں ہو نا۔ ایسا سوچتی ہو۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ ہمیں قدم قدم پر دکھ دینا چاہتا ہے۔ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہم اُس کے وجود کے بغیر بے سہارا ہو جائیں گے۔ مگر میں تمہیں صاف بتا دوں۔ اگر وہ اس گھر میں رہنا چاہتا ہے تو ہمارا ہر حکم ماننا پڑے گا۔ جیسا ہم سوچیں گے ویسا کرے۔ جہاں ہم اس کی شادی کریں وہاں ہماری لاج رکھے لیکن اس کے ساتھ شادی کر کے کون خوش رہ سکے گی۔

بیٹا دروازہ کھولو۔ ماں جیسے آخری بار اُسے آواز دیتی ہے۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آتی۔ ماں رونے لگ جاتی ہے۔ اور بوڑھا پریشان ہو کر اخبار ایک طرف پھینک دیتا ہے اور اپنے بیٹے کے کمرے کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

کمرے کو تو باہر سے تالا لگا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

بوڑھی عورت پھٹی آنکھوں سے تالے کو دیکھتی ہے۔ اور اُسے یقین نہیں آتا۔ رات کو آپ نے اُس کے لئے دروازہ کھولا تھا اور میں نے باورچی خانے سے تیسری مرتبہ کھانا گرم کر کے اس کے کمرے میں رکھا تھا تو پھر وہ کہاں گیا۔

کون ۔ ؟ بوڑھا پوچھتا ہے۔

کیسی بات کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے کو کون کہہ کر بات کرتے ہیں۔

میرا بیٹا۔ کہاں ہے وہ ۔

اس کمرے میں آ کر سویا تھا جب ہم انتظار کے بستروں پر نیند کی ہر شکن ٹٹول چکے تھے۔

تو پھر وہ گیا کہاں ؟ وہ عینک صاف کر کے دوبارہ دروازے پر لگے تالے کو دیکھتا ہے۔

وہ سوچتی ہے ،، کہیں آپ نے خود ہی تو اس دروازے پر تالا تو نہیں لگا دیا کہ وہ سوتے میں آپ پر حملہ نہ کر دے ۔،،

کیا مطلب ۔ وہ شک کی دیوار گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور بڑھیا کو سہارا دے کر کرسی پر لا بٹھاتا ہے ۔ گھبراہٹ ۔ بے چینی اور اُداسی ۔ وہ رات کا ایک ایک لمحہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی اور میں نے اپنے بیٹے کو نہ چاہتے ہوئے بھی گھر میں داخل ہونے دیا تھا۔

دونوں ہونٹ چپ اور چہرے بے جان ۔ خاموشی قطرہ قطرہ اُن کی آنکھوں سے ٹپک کر زمین کی طرف گرتی چلی جارہی ہے ۔

سیڑھی اور آدمی

حامد سروش

تب ان سبھوں کے سر ان کے سینوں پر جھک گئے کہ اس مسئلے کا حل ان کے پاس نہیں تھا۔ پھر انہوں نے یکبارگی اپنے جھکے سر اٹھائے، ان کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔ تب ایک شخص نے جس کے چہرے پر دانائی تھی اور آنکھوں میں سے دانش جھانک رہی تھی لیکن لہجے میں ٹوٹے ہوئے اعتماد کی کرچیاں تھیں کہا۔

ہم صدیوں سے اس پر سوچ رہے ہیں۔ ہم نے ہم سے پہلے گزرے ہوئے دانشوروں کی وہ کتابیں بھی پڑھیں جو ان کی زندگیوں کا نچوڑ تھیں لیکن ان کتابوں میں بھی ہمیں اس مسئلے کا حل نہیں ملا۔

تب اچانک دوسروں کو بھی زبانیں مل گئیں۔ انہوں نے اس شخص کو مخاطب کیا جو صدیوں سے ان کے سامنے کھڑا ان کے جواب کا منتظر تھا اور جواب بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے منہ میں دانت ہلنے لگے تھے۔ اور آنکھوں پر دھند نے پہرے بٹھا دیے تھے اور ہونٹوں پر سکوت نے تالے ڈال دیے تھے۔

اے شخص! ہماری دانش گہنا گئی ہے اور ہماری عقل جواب دے گئی ہے۔ ہم باوجود غور و فکر کے اب تک اس مسئلے کے حل تک نہیں پہنچ سکے۔

اس سے پہلے کہ سکوت کا تالا ٹوٹ کر گرتا ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور ان کے پاس پہنچ کر رک گیا تازہ خبر سننے کے لئے ان کے وجود کان بن گئے۔

اس نے کہا۔ وہ کہتا ہے کہ اسے نیچے اترنا نہیں آتا وہ نیچے کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا کہ اسے جھونک آتا ہے۔ اور زمین کی کشش ہاتھ بڑھا کر اسے کھینچنے لگتی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ اگر اس نے اترنے کی کوشش کی تو وہ زمین پر گر کر مر جائے گا۔ وہ کہتا ہے . . . .

کیا کہتا ہے؟ وہ سب یکبارگی چیخ اٹھے۔

وہ کہتا ہے کہ اگر تم اس درخت پر ایک اور درخت اگا دو تو میں اس پر بھی چڑھ سکتا ہوں لیکن اتر نہیں سکتا کہ میں درخت سے نیچے اترنے کا راستہ بھول گیا ہوں۔

وہ جھوٹ کہتا ہے۔

پھر ایک شخص نے جو گہری دھند میں کھویا ہُوا تھا کہا۔

کیوں نہ ہم اس درخت ہی کو کاٹ دیں کہ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔

اچانک جیسے یہاں سے وہاں تک ساری دھند چھپ گئی ہر شخص اپنے آپ میں شرمندہ تھا بھلا اتنا آسان حل اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ آؤ اس درخت کو کاٹ دیتے ہیں کہ درخت پر چڑھے ہوئے آدمی کو اتارنے کا یہی ایک مناسب حل ہے۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی ہاتھوں نے کلہاڑے سنبھال لئے۔ اور ان میں ہر شخص درخت پر پہلی ضرب لگانے کو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تب ایک شخص کہ اس کے چہرے پر گزرے زمانوں کی پرچھائیاں تھیں اور آنکھوں میں آنے والے زمانوں کا عکس۔ آگے بڑھا۔

ٹھہر جاؤ۔ اس نے درخت کی طرف بڑھتے ہوئے کلہاڑوں کو روک دیا، رک جاؤ، ۔ دیکھو! اگر تم نے اس درخت کو کاٹ دیا تو پھر تمہیں دُنیا کے کسی گوشے میں سایہ نہیں ملے گا۔ تمہاری نسلیں سائے کے لئے ترسیں گی۔ ایک شخص کے لئے درخت کو کیوں کاٹتے ہو۔ اپنے بچوں کے سروں سے سایہ چھیننے کے بجائے ان کندھوں کو تلاش کرو جو تم میں موجود ہیں۔ جن پر پاؤں رکھ کر یہ شخص درخت پر چڑھا تھا۔ تم غور سے دیکھو گے تو تمہیں آج بھی ان کندھوں پر اس کے پاؤں کے نشان نظر آجائیں گے۔

تب ان میں سے اکثر اپنے کندھے جھٹکتے ہوئے اور ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔

"مطلع" کے بعد

ڈاکٹر بشیر سیفی کا دوسرا مجموعہ کلام

گفتار

غزلیں، نظمیں، ہائیکو

شاخسار پبلشرز، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۶۰ راولپنڈی

اختر ہوشیارپوری

دل اُن کا جو قائل ہے تو منکر بھی یہی ہے
پہلا بھی یہی آخری کافر بھی یہی ہے

یہ سایہ سا جو راہ کی دیوار ہُوا ہے
شاید کہ محبت کا مسافر بھی یہی ہے

لفظوں کے طلسمات میں سوچوں کے گھروندے
تعمیر کنے جس نے وہ شاعر بھی یہی ہے

یہ دل جسے افسانہ و افسوں سے ہے نفرت
فرعون مقابل ہو تو ساحر بھی یہی ہے

میں نے جو یہاں شب کو تراشا ہے ستارہ
کس سے کہوں احباب کی خاطر بھی یہی ہے

جو گھر کے در و بام سے بیٹھا ہے لپٹ کر
ان نیلی فضاؤں کا وہ طائر بھی یہی ہے

یہ شخص کہ جو اپنا گلا گھونٹ رہا ہے
پوچھو تو جی اُٹھنے پہ قادر بھی یہی ہے

جو زخم بھی سینے میں ہے دامن پہ کھلا ہے
باطن بھی یہی ہے مرا ظاہر بھی یہی ہے

اختر کا سے نسبتِ عالی ہے غزل سے
کچھ عرض ہنر کرنے سے قاصر بھی یہی ہے

افضل منہاس

ذرا سنبھلنا، ہوائیں بے باک ہو گئی ہیں
سمندروں میں تو اور سفاک ہو گئی ہیں

سحر کا پودا ہری رُتوں میں نہ سُوکھ جائے
کہ اُس کی بیلیں تو کب کی خاشاک ہو گئی ہیں

یہ طفل جذبوں کی روشنی ہے، نہیں بجھے گی
جوانیاں جو سپردِ ادراک ہو گئی ہیں

اُداس شاخوں پہ جگمگاتے جو اوس قطرے
حسین پلکیں کچھ اور غمناک ہو گئی ہیں

عجب سفر ہے کہ پیچ و خم دیکھتے ہی اُس کے
مسافروں کی نگاہیں پیچاک ہو گئی ہیں

مرا زمانہ بھی انتقام کے حرف پڑھ لے
ادائیں اُس کی بہت ہی چالاک ہو گئی ہیں

دُکھوں کے پھولوں سے مہکی مہکی ردائیں ساری
کمال چاہت سے زیبِ لولاک ہو گئی ہیں

ان آسمانوں کو کون سا پھر لقب ملے گا
اگر زمینیں ہماری افلاک ہو گئی ہیں

تمازتیں ہیں کہ سر پہ سایہ فگن ہیں افضل
جو احتیں ہیں کہ دل کی پوشاک ہو گئی ہیں

ساحل احمد

(۱)

درد بویا ہے رات بھر بابا
صبح کاٹوں گا یہ شجر بابا
سخت مہنگا ہے اب سفر بابا
اپنا دریا ہے مشت بھر بابا
شاخ باقی نہیں ہے پیڑوں کی
کٹ چکے اپنے بال و پر بابا
تیری جھولی کی روٹیاں کھا کر
رقص کرتا ہوں رات بھر بابا
ہیں تشدد کی آفتیں موجود
اب نہ کیجئے یہاں سفر بابا
کس طرح روشنی کو دیکھوں میں
کھڑکیاں کھل گئیں اگر بابا
ذکر ورثے کا کیا کروں ساحلؔ
گر چکے سارے بام و در بابا

(۲)

کر دیا چاک آنی سے سینا
کتنا مشکل تھا وہاں پہ جینا
شہر سارا ہی تعفن سے بھرا
ذرّے ذرّے میں بسا تھا کینا
ہو کے محبوس سفر میں خود کو
کر دیا اور مقابل سینا
سر کو نیزے پہ اٹھا کر اپنے
کر دیا چاک بدی کا سینا
جل گئی صدق و صفا کی بستی
ایسا پھیلا تھا شہر میں کینا
سُرخ رو ہو کے جیئے تھے سب ہی
اس کو کہتے ہیں جہاں میں جینا
تم نے سکھلائے سلیقے ہم کو
کس کو آتا تھا یہاں پہ پینا

(۳)

یاد تیری بے تحاشہ آئے گی
لے کے خوشبو کا لبادہ آئے گی
روک لوں گا ایک تتلی میں ضرور
جب سنانے وہ فسانہ آئے گی
صبح ہوتے ہی شفق کی روشنی
پھر دکھانے اک تماشہ آئے گی
موسموں کی یہ ہوا خوشبو بھری
لے کے گیتوں کا ترانہ آئے گی
رات سورج ڈوبنے کے بعد ہی
لے کے اپنا شامیانہ آئے گی
گھوم پھر کر آشیانے کی طرف
لے کے تیروں کا نشانہ آئے گی
کر دیا مصلوبِ ساحلؔ نے مجھے
دیکھنے دُنیا تماشا آئے گی

(انڈیا سے)

جمیل ملک

کوئی کہاں تک دل کو سنبھالے
رشتے سارے غرضوں والے
چہرے ہیں آئینوں جیسے
رُوح کی دیواروں پہ جالے
راہ کے خار تو ہم چُن لیں گے
دل سے کانٹے کون نکالے
کیا منزل تک ساتھ بھی دیں گے
پاؤں کے چھالے دیکھنے والے
عشق کو مرکر زندہ کر جا
اور کوئی دن خاک اُڑالے
جو گمنام ہی مر جاتے ہیں
وہ ہیں سپاہی وہ ہیں جیالے
طوفانوں سے ڈرنا کیسا
باہوں کو پتوار بنالے
دل روشن تو آنکھیں روشن
کیسے اندھیرے، کیسے اُجالے
سب کے ہاتھ میں ایک قلم ہے
جو جیسی تصویر بنالے
کام ہے کم اور نام بہت ہے
سب چہرے ہیں دیکھے بھالے

سجاد بابر

چراغوں کی طرف دیکھا تھا اک امکاں پر میں نے
روا رکھی ہے جنگ اپنے سے اِس میلان پر میں نے
کبھی آنگن کی بچھڑی رونقوں کے خط نہیں ملتے
کوئی چادر نہ ڈالی آس کے نقصان پر میں نے
کسی خود آشنا سے بات چلتی خود سروں جیسی
نچھاور آبرو کر دی عجب انجان پر میں نے
بھلا میں اور اُس کے لمس کی کشتی میں جا بیٹھوں
ہوا کا ظرف پرکھا ہے ابھی وجدان پر میں نے
جو اس کی رہگزر تھی وہ چناروں سے نکلتی تھی
اُٹھائی عشق پیچاں ساحلی دالان پر میں نے
یہ اب جو ایک گوشے میں پڑا ناکارہ لگتا ہے
بہت سے نقش بنواتے تھے اِس گلدان پر میں نے
سبھی کچھ رہن رکھا جا رہا تھا شہر کی خاطر
توکل کے خواب بھی پھیلا دیئے میزان پر میں نے

(جاری ہے)

اکبر حمیدی

ہم پہ بھی لُطفِ نظر کر پیارے
چاند سا چہرہ ادھر کر پیارے

رہے آباد ترا شہرِ جمال
اس گلی میں بھی گزر کر پیارے

کب سے خالی ہے یہاں دل سا مکاں
یہ مکاں ہے اِسے گھر کر پیارے

عقل کو راہ نما کر اپنا
دل کے رستوں پہ سفر کر پیارے

رکھ قدم جسم کے پانی پت میں
اور کچھ فتح و ظفر کر پیارے

کوہساروں پہ نوازش کب تک
راہ گزاروں کو بھی بَر کر پیارے

کیوں پھرا کرتا ہے تنہا اکبرؔ
آ مرے ساتھ بسر کر پیارے

ساحرؔ مصطفائی

ہم جدھر سے گزر گئے یارو
بن کے خوشبو بکھر گئے یارو

اپنی جاں سے گزر گئے یارو
کچھ نہ کچھ تو وہ کر گئے یارو

مرہم وقت کی کرامت سے
زخم جتنے تھے بھر گئے یارو

اب بھی اک پیڑ ہے وہیں پہ کھڑا
کتنے طوفاں گزر گئے یارو

اک قطرہ بھی ہم کو مل نہ سکا
چڑھتے دریا اُتر گئے یارو

کتنے حساس ہو گئے ساحرؔ
اپنی آہٹ سے ڈر گئے یارو

سہیل اختر

گزارو گے اکیلے کیسے دیواروں کے جھرمٹ میں
مناسب ہے کہ آ بیٹھو پرستاروں کے جھرمٹ میں
وفا کیشو بھلا اُس سرو قد سے دوستی کیسی
سمٹ کر رہ گیا ہو جو ہوس کاروں کے جھرمٹ میں
اگر زخمی ہیں پاؤں خارزاروں میں تو کیا غم ہے
کسی دن ہم بھی پہنچیں گے چمن زاروں کے جھرمٹ میں
یہ کیسا دور ہے ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے
الجھ کر رہ گیا ہو جیسے تلواروں کے جھرمٹ میں
پشیمانی کے اشکوں سے بنائے کعبہ پڑتی ہے
حرم کے دیپ جلتے ہیں گنہگاروں کے جھرمٹ میں
وہ کس کے عنبریں گیسو کھلے تھے میرے بازو پر
رہ خلوت ہوش کھو بیٹھی تھی مہکاروں کے جھرمٹ میں
یہ کیسی کہکشائیں جھلملا اُٹھی ہیں پلکوں پر
یہ کس کی یاد آئی ہے ابھی تاروں کے جھرمٹ میں
غزلوں کی بزم میں جیسے کوئی بلبل چہکتا ہے
غزلخواں ہے سہیل اس طرح فنکاروں کے جھرمٹ میں

انوار فیروز

ہر دور میں انساں کے نمائندہ رہے ہیں
ہم زیست کے ماتھے پہ درخشندہ رہے ہیں
دیوار گراتی ہے تو رستہ بھی ملا ہے
ہم لوگ تو منزل کے لئے زندہ رہے ہیں
اب زیست کے ساحل پہ سکوں چھانے لگا ہے
اک عمر سے ہم اس کے ہی جوئندہ رہے ہیں
گزرے ہوئے لمحوں کا لہو رنگ تھا چہرہ
ہم لوگ اسیرِ غمِ آئندہ رہے ہیں
وہ نقشِ وفا ہیں جو مٹائے نہیں مٹتے
حالات کی ظلمت میں درخشندہ رہے ہیں
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہی دُنیا!
ہم لوگ وفاؤں کے نمائندہ رہے ہیں
اب ہم سے وہ انوارؔ نظر کیسے ملائیں
ماضی میں جو ہر شخص سے شرمندہ رہے ہیں

ندیم نیازی

جو میرے دیدۂ نمناک سے ٹپکا ہوگا
اس لہو کو تو کبھی تم نے بھی دیکھا ہوگا

دار پر آدمِ خاکی کو سجانے والو
یہ مروّت تو نہیں ایک تماشا ہوگا

عُمر بھر جاگنے والا نہیں سویا شاید
اُس کی آنکھوں نے کوئی خواب تو دیکھا ہوگا

جس نے مسموم بنا ڈالا میرے کھیت کا حُسن
اُس ہَوا کا بھی کہیں کوئی ٹھکانا ہوگا

کاش گر تا مرے دامن میں وہ موتی بن کر
ایک آنسو جو تیری یاد میں ٹپکا ہوگا

جیسے دل مرا منوّر ہے تری کرنوں سے
یونہی خورشید ترے بام پہ چمکا ہوگا

بشیر سیفی

جو تیرگی تا سحر گئی ہے
لہو کو بیدار کر گئی ہے

اجل نے پاؤں جکڑ لئے تھے
حیات کب چھوڑ کر گئی ہے

کشش سے آزاد ہو رہا ہوں
زمیں کی گردش ٹھہر گئی ہے

ازل سے ہم دونوں آشنا تھے
نگاہ کیسے مکر گئی ہے

غبار چہرے پہ رہ گیا ہے
ملال کی رَو گزر گئی ہے

میں اب بھی اس کی گرفت میں ہوں
وہ ایک خواہش جو مر گئی ہے

خبر یہ کیا شام نے سنائی
ہَوا چراغوں سے ڈر گئی ہے

میں اس پہ کیوں منفعل ہوں سیفی
وہ زندگی جو گزر گئی ہے

شوکت مہدی

پہلے تو اُسے دیکھ کے پتھرا سا گیا تھا
سانسوں سے مگر اپنی وہ مہکا سا گیا تھا

اک دُھوپ کا صحرا تھا میسّر مجھے ورنہ
بادل کی طرح سر پہ کوئی چھا سا گیا تھا

اتنی بھی ابھی اُس سے رہ و رسم کہاں تھی
آنکھوں کو وہ اک روز یونہی بھا سا گیا تھا

اک پیڑ کے مانند، کوئی پریم نگر میں
شاخوں کی طرح جھُوم کے لہرا سا گیا تھا

صورت سے تو وہ اب بھی بھلا لگتا ہے مہدی
باتوں سے کبھی اپنی جو بہلا سا گیا تھا

آثم فردوسی

بات دل کی نہ جب سُنی جاتے
پھر سرِ عام کیوں نہ کی جاتے

اب نہ اُٹھیں گے اُس کی محفل سے
آن جاتے کہ زندگی جاتے

لوٹ آئیں گے پھر نگاہوں میں
ہم کو دل سے صدا تو دی جاتے

مشورہ ہر سُو ہے اُس کے لہجوں کا
کیسے ؟ گیتوں کی بات کی جاتے

چاہتوں کی بہار ہیں ہم لوگ
اپنی خُوشبو گلی گلی جاتے

ہر نئی رُت کے رازداں ہیں ہم
ہم سے موسم کی بات کی جاتے

یوں وہ مجھ سے جُدا ہُوا آثم
جیسے پھُولوں سے تازگی جاتے

پر کام کرنے والے طلبہ کے مقالات دیکھتا ہوں تو ان میں عبدالواسع صاحب کی کتاب کے حوالے متعدد مقامات پر نظر آتے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ اس کتاب کو کسی نہ کسی طرح فراہم کر لیتے ہیں اور پھر اس سے بے دریغ استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ فنِ "سوانح نگاری" حوالے کی ایک ایسی کتاب ہے جسے دیکھے بغیر سوانح اور احوال و آثار کی بحث آگے نہیں بڑھائی جا سکتی۔

وہاب اشرفی صاحب نے لکھا ہے کہ

"ڈاکٹر عبدالواسع ادبی دنیا میں غیر معروف نہیں۔ "فنِ سوانح نگاری" اور "بہار میں اردو سوانح نگاری" ان کی معتبر کتابیں ہیں۔ جستہ جستہ مضامین بھی اُردو کے مؤقر رسالوں میں اشاعت پذیر ہوتے رہے ہیں جن کی پذیرائی اُردو کے معروف نقادوں نے کی ہے۔"

میں نے ابتدا میں ڈاکٹر عبدالواسع کے تعارف کو بے ضابطہ شمار کیا ہے تو اس کا باعث بھی ان کے جستہ جستہ مضامین ہیں۔ جو بے شک ہندوستان کے مؤقر ادبی رسائل میں شائع ہوتے لیکن پاکستان کے ادبی حلقوں تک پہنچ سکے۔ بارے ڈاکٹر عبدالواسع کی کتاب "مفہوم کی سمت" منظرِ عام پر آئی تو ان کے مزید ادبی تعارف کا باعث بنی۔ اور مجھے ان کی تنقیدی جہات سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اور اب اگر میں اسے باضابطہ تعارف بھی شمار کروں تو شاید جائز ہوگا۔

یہاں اُردو تنقید کے آغاز و ارتقا کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تاہم اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ انیسویں صدی کے ربعِ آخر میں مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے جب تذکروں کی تاثراتی تنقید سے ایک قدم آگے بڑھایا تو حالی نے نظریہ سازی کو فوقیت دی اور اس کے لئے مغرب کے افکار سے استفادہ کرنے کے باوجود اپنے مشرقی مزاج کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کی۔ حالی کی نظریاتی دانش مغربی وضع کی ہے لیکن عملی تنقید پر مشرق کی تہذیبی وضعداری غالب ہے۔ محمد حسین آزاد نے بھی قدیم اور جدید کے سنگم کو قبول کیا۔ لیکن انہوں نے تخلیق کے وہبی عمل کو زیادہ اہمیت دی اور تنقید کو تخلیق کے مقام پر لانے کی سعی کی۔ انہوں نے تنقید کو ایک الگ جزیرہ بنانے کے بجائے اسے ادب کے براعظم کا حصہ شمار کیا اور اس کا تمام جوہر تذکروں سے کشید کیا۔ بالفاظِ دیگر تحقیقِ ادب محمد حسین آزاد کی تنقید کی اساس بھی ہے اور اس ربطِ باہم کا وسیلہ بھی جو آزاد ماضی اور حال کے درمیان قائم رکھنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے حالی اور آزاد پر سرسید احمد خاں کے اثرات تسلیم کئے ہیں لیکن ان کا یہ نتیجہ بے حد معنی خیز ہے کہ۔

"انیسویں صدی کے ربعِ آخر میں ادب اور سیاسی سماجی حالات کے رشتے کا احساس ایک پُرزور دھماکے کی حیثیت رکھتا تھا اور بہت سے اذہان اس سے بُری طرح متاثر تھے۔"

ساغرؔ مشہدی

جہاں میں غم کے سوا کچھ بھی اپنے پاس نہیں
یہی سبب ہے کہ جینے کی ہم کو آس نہیں

یہ داستانِ ازل ہے ابد سے وابستہ
مرے فسانۂ ہستی کا اقتباس نہیں

شعورِ زیست کا حاصل فقط ہے تنہائی
سو وہ بھی آج کسی اہلِ دل کے پاس نہیں

مرا مزاج، محبت کی رُت میں ڈھل نہ سکا
مرے مزاج کو شاید یہ فصل راس نہیں

رہِ حیات میں ایسے بھی کچھ مسافر ہیں
نظر میں یاس کا صحرا، لبوں پہ پیاس نہیں

وہ کہہ رہا ہے مگر کس طرح یقین کریں
تمام لوگ ہیں شاداں کہیں ہراس نہیں

تباہیوں کا سہارا نہ کوئی ہے ساغرؔ
تباہیوں کا کوئی بھی قدر شناس نہیں

خاورؔ اعجاز

حرفِ دُعا بنوں تری تحریر میں رہوں
یہ اِذن دے کہ منظرِ تصویر میں رہوں

مجھ کو عطا ہوئی ہے جب آزادیٔ سفر
پھر کیوں کسی کے حلقۂ زنجیر میں رہوں

رہتا ہے جو تصوّرِ آفاق میں کہیں
اُس خوابِ کائنات کی تعبیر میں رہوں

اک ماہِ شوق جو کہ مرا امتیاز ہے
زندہ اُسی کے ہالۂ توقیر میں رہوں

صبحِ ازل بھی میں تری روشن سحر میں تھا
شامِ ابد بھی میں تری تنویر میں رہوں

تبصرے

ادارہ

تبصرہ کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نادید :- مصنف :- جوگندر پال، صفحات ۲۴۰، قیمت پچاس روپے

ناول

تقسیم کار :- رابطہ گروپ ۱۸ راجندر پارک نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

جوگندر پال بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی متنوع تخلیقات سے اردو ادب کا دامن بھر دیا ہے۔ اس ناول میں ایک بالکل اچھوتے موضوع کو اپنایا ہے اور ہم آنکھوں والوں کو اندھوں کی دنیا کی سیر کرائی ہے۔ اندھوں کے جذبات و محسوسات کسمپرسی اور بیچارگی کے پس منظر میں جینے کی امنگ ان کے حوصلوں کی بلندی اور ہر قسم کے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت کا منظر دکھایا ہے۔ ایک آنکھوں والے کا اندھا بن کر ان کی رہنمائی کرنا، اپنی انسانی اور اخلاقی کمزوریوں پر پردہ ڈالے رکھنا، اندھوں کی دنیا میں اپنی مقبولیت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ناول کے ایسے مقامات ہیں جہاں قاری واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ کہانی کروڑوں عوام کی ہے جو اندھی عقیدت کے ہاتھوں صدیوں سے دھوکے کھا رہے ہیں اور ان کی رہنمائی کا دعویٰ کرنے والے کس طرح ان کی بے خبری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ایک بات جو ناول کو ہمارے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے وہ بابا کا آخری اقدام ہے جب اس کا ضمیر جاگتا ہے اور وہ اپنی تمام کوتاہیوں کے اعتراف کے ساتھ اپنی جان دے کر اپنی تمام غلطیوں کا ازالہ کر دیتا ہے۔ ناول موضوع کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے اس سے استفادہ کرنا ہر آنکھوں والے کا فرض ہے۔

——— سیدہ حنا

برگ نامہ شاعر :- ساحل احمد، صفحات ۱۱۲

ناشر :- لٹریری بک سنٹر ۱۳۶ چک الہ آباد، بھارت

ساحل احمد ایک جانے پہچانے قادر الکلام شاعر ہیں۔ برگ نامہ ان کی مختصر مگر خوبصورت شعری تصنیف ہے چھوٹی بحروں میں لکھی ہوئی ہلکی پھلکی غزلیں قاری کا دامن دل تھام لیتی ہیں۔ زبان اتنی سادہ، رواں اور آسان ہے کہ معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ ساحل احمد کی اردو آج کی اردو ہے۔ یہ

اردو اگر پاکستان میں بھی لکھی جانے لگے تو موجودہ نوجوان نسل شاید اُردو کی طرف لوٹ آئے اور اُردو کی مقبولیت میں حیرت انگیز اضافہ ہو۔ بعض اہل نظر کے برعکس ساحل چاہتے ہیں کہ اُردو شاعری میں دوہا، گیت، ماہیے، تراٹلے، سانٹس اور ہائیکو کو بھی جگہ ملنی چاہیے۔ کیونکہ ان میں وہ تخلیقی صفات موجود ہیں جو اچھی شاعری کے لئے ضروری ہیں۔ ساحل احمد نے ہائیکو کا وزن بھی متعین کیا ہے اور اُردو شاعری میں مثلث کو بھی رواج دینے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ ترجیعی ہائیکو اور ہاک بھی ان کی ایجاد ہے۔ برگ نامہ پیران کا لکھا ہُوا پیش لفظ اُردو اصنافِ سخن پر ایک گراں قدر لیکچر سے کسی طرح کم نہیں۔ اسی لئے احتشام حسین نے ان کے لئے لکھا ہے "ساحل احمد خوش فکر شاعر بھی ہیں اور اچھے شعر و ادب کے نبّاض بھی۔"

نفرت بونا ذہنوں میں — ایک طرح کا فیشن ہے
رنگ برنگے پھولوں کی — اب دہوا بھی دشمن ہے
ایک پرندہ شاخ پہ بیٹھا — جاتا موسم دیکھ رہا تھا
نیند کھُلی تو آنگن میں — بارش بھیگ رہی تھی

(سیدہ حنا)

رلکے کے نوحے

ترجمہ

مترجم : ہادی حسن ۔ صفحات ۱۶۰

ناشر : اُردو رائٹرز گلڈ، الہ آباد، بھارت

"جے بی لیشمن کے مطابق رلکے کی شاعری کا انحصار ان عقیدوں یا خیالات پر نہیں ہے جو اس میں سے برآمد کر کے پیش کئے جا سکتے ہیں بلکہ دراصل ان ناقابلِ اخذ واردات، مدرکات اور بصیرت کے عوامل پر ہے جو اس نے اتنے غائر، اتنے جیتے جاگتے، اتنے مرتکز انداز سے ہم تک پہنچائے۔" اور جناب ہادی حسن نے خوبصورت منظوم ترجمہ کے ذریعہ اُردو کے عام قاری کو ان تک رسائی حاصل کرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ ہادی حسن نے ایک اہتمام یہ بھی رکھا ہے کہ ہر نوحے کے شروع میں اس کا نفسِ مضمون نثر میں بیان کر دیا ہے تاکہ قاری کو نوحہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ شمیم احمد کہتے ہیں "رلکے کے نوحوں کی ذہنی فضا اور جذباتی مزاج اس آدمی کا مزاج ہے جو کلیتہً اپنی ذات کی گہرائیوں میں اُتر گیا ہو۔ رلکے کے نوحوں میں مزاج موضوع اور اندازِ فکر کی وحدت ملتی ہے۔ یہ سب نوحے مل کر ایک اکائی بناتے ہیں۔ ان نوحوں کا موضوع دنیا و کائنات میں انسان کے مقام کی تلاش ہے۔" جرمن زبان میں لکھے گئے ان نوحوں کا ترجمہ سب سے پہلے انگریزی زبان میں ہوا۔ انگریزی سے ہادی حسن نے بڑی محنت اور کمال مہارت سے انہیں اُردو داں طبقے تک پہنچایا۔ کتاب کے آخر میں رلکے کے کچھ خطوط بھی دیئے گئے ہیں جن سے اس کی شاعری کا پس منظر سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے فلسفہ حیات کے کچھ پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ ہادی حسن کی اس محنت کو نہ سراہنا زیادتی ہوگی۔

(سیدہ حنا)

چہرہ
افسانے

مصنف : ساحل احمد ، صفحات ۱۲۸ ، قیمت بیس روپے
ناشر : لٹریری بک سنٹر الہ آباد ، بھارت

ساحل احمد کا دعویٰ ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز کہانیوں سے ہوا ، شاعری بعد کی بات ہے۔ انہوں نے بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔ اختصار اور زبان و بیان کی سادگی جن کی خصوصیت ہے۔ اس مجموعے میں ان کی طویل مختصر ۲۴ کہانیاں شامل ہیں۔ ہر کہانی کا موضوع جدا اور زبان و بیان عام فہم ہے۔ وہ سیدھے سادے انداز میں کہیں کہیں بہت گہری باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جنہیں سمجھ کر ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں کس طرح کہانی بن جاتی ہیں۔ یہ دیکھنا ہو تو ساحل احمد کی کہانیاں پڑھئے۔ خود کہتے ہیں ، بہت ساری ابتدائی ، رومانی اور نیم رومانی کہانیوں سے قطع نظر چہرہ میں جو کہانیاں شامل ہیں ان کے تئیں میرا رویہ ہمیشہ مخلصانہ رہا ہے۔ کوئی بھی چیز خواہ نثر ہو یا شاعری مراقبہ ضروری ہے ، ریاضت تو ثانوی چیز ہے۔ گویا ع

فن محنت و ریاضت محویت و عبادت

(سیدہ حنا)

ٹوٹی کہاں کمند
افسانچے

مصنف : سید معصوم شاہ ثاقب ، صفحات ۸۰
ناشر :- مستجاب پبلیکیشنز کوہاٹ

یہ معصوم شاہ ثاقب کے ۴۰ افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے اس کا مجموعہ بند مٹھی شائع ہو کر قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ معصوم شاہ کا مشاہدہ گہرا اور اندازِ بیان سادہ ہے اور یہی انداز اسے انفرادیت بخشتا ہے۔ معصوم شاہ کی دوسری خصوصیت اس کا انہماک اور لگن ہے۔ وہ جس تواتر اور تسلسل کے ساتھ صلہ و ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر لکھے جا رہا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے ایک دن وہ بالآخر فن کی اس منزل تک پہنچ جائے گا جس تک پہنچنے کی آرزو ہر فنکار کے دل میں دھڑکتی ہے لیکن ع کون سا رے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے ہمیں امید ہے کہ وہ اسی طرح اپنے گرد و پیش کے موضوعات کو کہانیوں کی شکل دے کر قارئین کو پیش کرتا رہے گا۔

(سیدہ حنا)

اصغر علی تبسم کا پہلا شعری مجموعہ

آتشِ احساس

تبسم صحت مند اور توانا جذبوں کے شاعر ہیں۔ اگرچہ رومان ان کی شاعری کا کلیدی نقطہ ہے اور عشق ان کا رہنما ستارہ۔ لیکن وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر بھی نہیں ہیں۔ " پروفیسر سہیل اختر "

قیمت ۱۰۰ روپے

ناشر :- دار الکتاب۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور

بزمِ احباب / قارئین

ڈاکٹر جمیل جالبی - اسلام آباد

"ابلاغ" کا شمارہ نمبر ۸ موصول ہوا جس کے لئے شکر گزار ہوں۔ اس دور میں جب ادبی پرچے خال خال ہی رہ گئے ہیں "ابلاغ" کی اشاعت یقیناً ایک کارنامہ ہے۔ یہ شمارہ اپنے تنوع کی وجہ سے پسند آیا۔ میں انشاء اللہ جلد کوئی تحریر آپ کو بھجواؤں گا۔ (بنام نسرین سروش)

ڈاکٹر انور سدید - لاہور

سلام مسنون! سب سے پہلے یہ اطلاع عرض ہے کہ اگلے ماہ ڈاکٹر وزیر آغا اور میں پریس ایشیا فورم کی دعوت پر ہندوستان جا رہے ہیں اس لئے آج طویل ملاقات "ابلاغ" کا نیا پرچہ مل گیا ہے۔ میں نے یہ پرچہ اسلام آباد میں اکبر حمیدی صاحب کے ہاں بھی دیکھا تھا۔ اس کرم کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ اس دفعہ محترمہ سیدہ حنا نے مرد معاشرے کے ادیبوں کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے اور خوب رکھی ہے۔ اُن کا اداراتی شذرہ "خواتین کی شاعری" محض ان کی ذاتی آواز ہی نہیں بلکہ اس میں وہ آنسو بھی مجسم ہے جو ہر خاتون شاعرہ کے دل سے نکلتا ہے اور زندگی بھر پلکوں پر آویزاں رہتا ہے۔ سیدہ حنا کا اظہار جرأت مندانہ ہے۔ ان کا یہ سوال واقعی جواب طلب ہے کہ

کیا شاعرات کا جوان اور خوبصورت ہونا بہت ضروری ہے؟

جواباً عرض ہے کہ "ہرگز نہیں"؟ شاعرہ کے بجائے شاعری کا خوبصورت اور تازہ فکر ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ہماری شاعرات ایک بوالہوس اور حسن پرست معاشرے میں سانس لے رہی ہیں اور مرد حضرات جب بھی ان پر نظر ڈالتے ہیں تو بُری نظر ہی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ قلم کانفرنس میں انہوں نے مرد حضرات کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ

"منتظمین نے عمر رسیدہ خواتین شاعرات کو بُلا کر اچھے ذوق کا ثبوت نہیں دیا۔"

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

تو قصور اہلِ قلم کانفرنس کے منتظمین کا نہیں تھا بلکہ اُن مرد حضرات کا تھا جنہوں نے شاعرکے لبادے میں ایک بوالہوس کو پناہ دے رکھی تھی اور بوالہوس نوجوان شاعرات کو حریص نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ ایک شاعرہ نے شاید میری بزرگی پر اعتماد کیا اور شکایتاً کہا کہ انہیں یوں لگتا ہے جیسے "وہ وحشی نظروں میں گھری ہوئی ہیں، اور ہر طرف سے ان پر بھوکے گدھ لپک رہے ہیں۔"

سچی بات یہ ہے کہ میں اس شکایت کے سامنے آج تک سرنگوں ہوں اور آج بھی ندامت کا اظہار کر رہا ہوں۔ میرا ایقان ہے کہ ایک طبقے نے ادب کو عبادت کا درجہ نہیں دیا بلکہ ادب سے دولت، شہرت، حکومت اور عورت تک رسائی حاصل کرنے اور اپنے مذموم مقاصد پورے کرنے کا کام لیا ہے اور بزرگی کا احترام پیدا کرنے کے بجائے غنڈہ گردی کا خوف ابھارا ہے۔ شاعری میں نام پیدا کرنے کی آرزو سے کر نوخیز لڑکیاں منظر پر آتی ہیں اور چند ادبی غنڈوں کے دامِ تزویر میں پھنس جاتی ہیں، جسم کے ساتھ روح کو بھی آلودہ کر لیتی ہیں۔

بات پھیل گئی لیکن آپ شاید میرے ساتھ متفق ہوں کہ اس صورتِ حالات کو ان "شاعرات" نے ہی فروغ دیا ہے جن کے داخل میں اظہار کا فطری اور حقیقی شعلہ موجود نہیں تھا۔ وہ سہاروں کی تلاش میں نکلیں تو اپنا آپ گم کر آئیں۔ انہوں نے شاعری کم کی اپنی نسوانیت کی نمائش زیادہ کی۔ چنانچہ عمر رسیدہ اور کہنہ سال شعراء بھی اس نمائش میں ایمان سلامت نہ رکھ سکے۔ بلکہ اپنی اپنی گٹھڑیاں اُٹھا کر بازارِ عمل میں آ گئے۔

سیدہ حنا صاحبہ نے بات دوٹوک انداز میں کی ہے۔ مرد شاید اسے تشویش کی نظروں سے دیکھیں، اور اس کمزور آواز کو دبا دیں، تاہم مجھے یقین ہے کہ سیدہ حنا کو جنسِ لطیف سے خاطر خواہ تعاون حاصل نہیں ہوگا۔ اور جب تک یہ تعاون دستیاب نہیں، ان کی آواز صدا بصحرا رہے گی، آپ نے ایک قبیح قومی عیب کو نمایاں کیا ہے لیکن یہ ردِ عمل بھی صحت مندانہ نہیں ہے کہ:-

"اہلِ قلم کانفرنس میں جو مرد حضرات شریک تھے ان میں اکثریت ان حضرات کی تھی جو عمر اور صورت شکل کے لحاظ سے تو خیر گئے گزرے تھے ہی فن کے لحاظ سے بھی بس واجبی ہی سے تھے[1]۔"

اس سے تو یہی ظاہر ہوگا کہ جس عمل میں مرد مبتلا ہیں اسی میں خواتین بھی شریک ہیں۔ حالانکہ حقیقت شاید اس کے برعکس ہے۔ اداریہ مجمل ہے۔ اس پر تفصیل سے لکھنے اور پھر اسے ایک فعّال اور مؤثر تحریک بنانے کی ضرورت ہے۔

"بزمِ احباب" میں اس ناچیز انور سدید کو بھی موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ میرے لئے اس میں خوشی کا پہلو یہ ہے

---

[1] پوری بات یوں تھی، کہنے کو تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ

کارارباب قلم نے کھل کر بات کی، میری بعض خامیوں یا خامکاریوں کی نشاندہی کی ہے، اور مجھے چند بے حد مفید مشورے دیے ہیں بشیر جاہد صاحب اور میر حسین علی امام صاحب کا بالخصوص ممنون ہوں۔ تاہم اتنی بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ ریویو تاثر میں چونکہ آنکھوں دیکھی حقیقت اور کانوں سنی بات کو صداقت سے پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے صورت واقعہ کو تبدیل کرنے یا اسے الفاظ کے خوش رنگ سحر میں چھپانے کا حق حاصل نہیں تھا۔ میں نے جو دیکھا جو سنا وہی لکھا ہے۔ چنانچہ بعض ادباء کے "اعمال صالحہ" اور بعض بلند بانگ دعاوی ضبط تحریر میں آگئے ہیں تو انہیں قبول کرنا ادبی معاشرے کا اختیار تمیزی ہے۔ میں اس کی صحت اور صداقت کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ میر حسین علی امام صاحب نے جسے معاصرانہ چشمک کا عنوان دیا ہے میں اسے ادبی معاشرے کے مصائب میں شمار کرتا ہوں۔ اور ان مصائب کے خلاف آواز اٹھانا اپنا ادبی فریضہ سمجھتا ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی صاحب وزیر آغا کے انشائیہ، چالیسویں سالگرہ" کو پہلے چارلس لیمب کی کلاسیکی حیثیت کی مثال قرار دے اور پھر کچھ عرصے کے بعد اپنی رائے تبدیل کرلے تو اسے کچھ نہ کچھ جواز تو پیش کرنا چاہیے جبکہ نہ چارلس لیمب نے دوبارہ زندہ ہو کر نئے انشائیے لکھے ہیں اور نہ وزیر آغا نے انشائیہ، چالیسویں سالگرہ" میں کوئی تبدیلی کی ہے۔ اور اگر یہ واقعہ برسر محفل اور اپنی رائے تبدیل کر لینے والے نقاد کی موجودگی میں پیش کیا جائے تو یہ ریویو تاثر کا حصہ کیوں نہ بنے؟

اس قسم کی متعدد مزید مثالیں بھی ہیں جنہیں یہاں اقتباس کرنے کا محل نہیں ہے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے حضرات بالا کی تنقید اچھی لگی ہے اور جس شائستگی سے انہوں نے اعتراض اٹھایا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ میں اس پر سنجیدگی سے غور کروں اور انشاءاللہ کروں گا۔ خدا مجھے ان کے مشورے پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

افضل منہاس صاحب ایک عرصے سے شاعری کی دنیا سے غائب تھے۔ آپ نے ان پر گوشہ چھاپ کر گویا ان کی بازیافت کی ہے۔ رشید امجد، انور مسعود، فارغ بخاری اور انور فیروز صاحب نے انہیں فن آشنا نظروں سے دیکھا ہے۔ یہ مقالے انہیں یقیناً مینو پاثریت سے نکلنے میں مدد دیں گے۔

اس دفعہ غزلوں میں مایوسی اور پژمردگی عجب عجب انداز میں مجسم ہوئی ہے۔ مثلاً اختر ہوشیارپوری کے ہاں آنسو کے مٹی ہو جانے سے مایوسی پیدا ہوئی ہے۔

مٹی کے کھلونے تو نہ تھے آنکھ کے آنسو
مٹی کا مگر رزق ہوا آنکھ کا نم بھی

یہی آنسو ساحل احمد کے ہاں تارا بن کر اترا ہے اور ایک اور طرح کی پژمردگی عیاں کرتا ہے۔

ایک چمکتا تارا ہے
درد شکستہ آنکھوں میں

اکبر حمیدی نے لاحاصلی کے خوف کو مجسم کرب کی صورت دے دی ہے۔ وہ بے یقینی کے عمل سے گزرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ؎

خونِ دل سے سینچتا تو ہوں شجرِ اُمید کا موسم آئے تو خدا جانے ثمر کیسا لگے

انوار فیروز نے زمانے کے ساتھ ہم قدم رہنے اور سمے کو اپنی چال چلنے کی اجازت دی ہے۔ ان کے ہاں مایوسی نے بے بسی کی صورت اختیار کر لی ہے۔

غموں کا سیل دلوں سے گزر ہی جائے گا چڑھا ہُوا ہے جو دریا اُتر ہی جائے گا

ڈاکٹر بشیر سیفی خود اپنی بینائی کے زخم خوردہ ہیں۔ ان کی مایوسی کی نوعیت جُداگانہ ہے۔

بارہا میں نے یہ سوچا ہے "میں اندھا ہوتا" مجھ کو وہ زخم دیئے ہیں میری بینائی نے

ساغر مشہدی، شوکت مہدی، آثم فردوسی، خاور اعجاز نے بہت اچھی غزلیں کہی ہیں۔ ایوب صابر کی غزل کا یہ شعر کیسی ظالم تنہائی کا اشاریہ بن گیا ہے۔

باہر سے گھر لگتا ہے اندر میں ہی اکیلا ہوں

میرا ایک مضمون آپ کے پاس موجود ہے۔ اس لئے مزید کچھ بھیجنا تو شاید مناسب نہیں۔ آپ نے تین چیزیں مانگی تھیں۔ پرچے کی رسید، رائے اور تازہ تخلیق۔ میں تعمیل کے طور پر اتنا طویل خط پیش کر رہا ہوں۔ اور اب آپ کے جواب کے لئے چشم براہ ہوں۔ اور ہاں عذرا اصغر صاحبہ کے مشورے پر ہرگز عمل نہ کیجئے۔ بے جا ستائش کے دور میں صداقت کے عَلَم کو مضبوطی سے تھامے رکھئے۔ (بنام حامد برگ شی)

ندیم نیازی۔ رحیم یار خاں

تسلیمات! آج ابلاغ کا تازہ شمارہ ملا۔ اس کرم فرمائی کے لئے سراپا سپاس ہُوں۔ میرے نزدیک اداریہ کا مطالعہ اتنا ضروری ہے جتنا نظم و نثر کا حصہ۔ اداریہ سے یاد آیا۔ ایک صاحب نے فاران کے مدیر کو لکھا "اپنے اداریہ میں سیاست کو نہ گھسیٹئے"، مگر میں نے لکھا "ادب اور زندگی سے سیاست جُدا نہیں بلند حوصلے سے اپنے مشن کو جاری رکھئے گا۔ آپ نے محترمہ صفیہ تبسم اور محترمہ زہرہ نگاہ کا ذکرِ خیر کیا ہے" محترمہ پروین شاکر کے بارے مشہور ہے کہ جناب احمد ندیم قاسمی اُن کو لکھ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح منورہ سلطانہ لکھنوی کو گل صدیقی امروہوی۔ سچ تو یہ ہے کہ ارمان عثمانی مرحوم نے راقم سے کہا تھا "معروف ناول نگار ایم اسلم نے تمام ناول مختلف ادیبوں سے خرید کر کے اپنے نام سے شائع کئے، اس نے میرے روبرو ایک ادیب کو دس ہزار روپے ناول کے ادا کئے تھے"، اور ساغر صدیقی کئی کتابوں کے مسودے اور غزلیں بیچ دیا کرتا تھا۔ اسی زمرے میں خواتین ہی نہیں مردوں کو بھی ادب کے سرقہ کا مجرم ٹھہرایا جاتا ہے اور ایسا ہوتا رہے گا۔ اس کا سدِ باب ادق اور محال ہے۔

چہرے، مناسب تعارفی روشن ہے۔ افضل منہاس صاحب کے لئے آپ نے ایک حصہ مختص کیا ہے۔ یہ ادبی

معلوماتی انداز خوب ہے۔ افضل منہاس صاحب کا کلام اپنی فنی اور شعری افادی حیثیت سے نمایاں اور قابلِ تحسین ہے۔ اگر ان کے اس ایک شعر کے بارے لکھا جائے تو دفتر درکار ہے اس میں حقیقت و معرفت اور طریقت کا رنگ گہرا ہے ؎

کون کہتا ہے خدا کی کوئی صورت ہی نہیں
میں نے تو دل کے خرابے میں خدا دیکھا ہے

آزاد نظم جدید صنفِ سخن کی ایک کمزور کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جناب احسان دانش، جناب حفیظ جالندھری، جناب ماہر القادری، جناب ارمان عثمانی وغیرہم نے مجھے مکتوبات میں اور بصورتِ ملاقات آزاد نظم لکھنے سے روکا۔ مبنی بر صداقت یہ منفی عمل آزاد نظم کے ناتواں پیکر کو مزید لاغر اور ضعیف کر رہا ہے کہ آزاد نظم کے اصول، قاعدہ اور ضابطہ سے بعض اہلِ قلم انحراف اور فرار حاصل کر چکے ہیں۔ تاہم جناب فارغ بخاری اور جناب پروفیسر حامد سروش کی آزاد نظموں نے متاثر کیا ہے۔ محترمہ سیدہ جناکے ماہیے خوب ہیں۔ آپ کی (محترمہ نسرین سروش) نثری نظموں میں اُلجھاؤ اور گنجلک نہیں ہے۔ تمثیل و استعارہ سے آزاد، سادہ سلیس انداز بھی ایک وصف ہے۔ جناب ڈاکٹر انور سدید کا انشائیہ "رشتہ دار" قابلِ قدر ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ چلی کا رشتہ و ناطہ (ناتا) ایک ہی ہو سکتا ہے کلمہ گو بھائی ہونے کا۔ محترمہ سیدہ جنا کی کتاب "جھوٹی کہانیاں" تو پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ کتاب کا نام صداقت کی ترجمانی ہے۔ لوگ کب جھوٹی کہانیوں کو جھوٹی کہانیاں کہنا پسند کرتے ہیں میں نے اس بات پر افسانے لکھنے ترک کر دیے تھے۔ جناب ڈاکٹر وزیر آغا کی غزل مرصع ہے۔ مگر یہ شعر حقیقت افروز ہے۔ مجھے وہ شعر اچھا لگتا ہے جو شعری حسن و بصیرت اور بصارت کے باوصف معنویت اور مقصدیت کے اعتبار سے قابلِ قدر ہو۔ شاعر کے قول و فعل کے مطابق ہو، متضاد نہ ہو اور زندگی کی حقیقت کے قریب تر ہو ؎

ہم ورقِ چاندی کے، اے پاگل ہوا — بھول کر بھی ہم سے تو ٹکرا نہیں

جناب اختر ہوشیار پوری کی غزل کا مطلع اور اس کے بعد کے دو اشعار لائقِ مطالعہ ہیں۔ فکر و سوچ کی دعوت دیتے ہیں ؎

کیا غم جو ہواؤں سے مٹے نقشِ قدم بھی — اب لوٹ کے آنے کے نہیں شہر میں ہم بھی

جناب اکبر حمیدی کا یہ شعر قابلِ تحسین ہے۔ اس میں گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے ؎

خونِ دل سے سینچتا تو ہوں شجرِ امید کا — موسم آتے تو خدا جانے ثمر کیا لگے

جناب ایوب صابر کا شعر اس پُرفتن دور میں آشوبِ زیست کی یوں عکاسی کرتا ہے ؎

کاش کوئی پوچھے تو سہی — کن حالات میں زندہ ہوں

متذکرہ غزل میں چند اور اشعار اسی مضمون و مقصد کی ترجمانی کرتے ہیں۔

انہیں افراد میں مولانا حالی بھی تھے۔ لیکن مولانا آزاد کی روش الگ تھی، انہوں نے ادب اور ثقافت کے نازک رشتے کو مضبوط کیا اور فطرت کو مناظرِ فطرت کے طور پر قبول کرتے ہوئے پہلی بار ثقافتی پس منظر کی اہمیت بھی اجاگر کی۔ اوّل الذکر جہت مارکسی تنقید میں نمایاں ہے جبکہ دوسری روش کا جدید روپ نارتھروپ فرائی کے ہاں نظر آتا ہے۔ جس نے نقاد کو تفتیشی افسر کے منصب پر بٹھانے یا اسے جرّاح کا کام سونپنے کے بجائے ایک تخلیق کار کے طور پر قبول کیا ہے۔

اس اجمال کی روشنی میں ڈاکٹر عبدالواسع کی تنقید کا تجزیہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان کے ہاں قدیم کی عظمت و شوکت بھی موجود ہے اور جدید کی عقلی روشنی اور تجزیاتی زاویہ بھی، وہ ادب میں نظریات کی بحث بھی اٹھاتے ہیں اور عملی تنقید میں ثقافتی اور تہذیبی پس منظر سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر وہ بحث کو کسی ایک نقطے پر مرتکز نہیں کرتے بلکہ نقطے کو ماخذِ نور تصور کرتے ہیں اور اس سے جو شعاعیں مختلف سمتوں میں نکلتی ہیں ان کی نشاندہی کرتے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالواسع کا یہ نظریہ ان کے ادبی مزاج میں شاید بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ

"جغرافیائی، قومی اور نسلی حد بندیاں فن و ادب کے لیے سدِّ راہ نہیں بنتیں، بلکہ اس کے پردے میں انسان کی وہ جبلّت پوشیدہ نظر آتی ہے جو اس کو خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے"

ان کا یہ استخراج محض توجہ طلب نہیں بلکہ داد کا مستحق ہے کہ

"سیاست کی دنیا میں بین الاقوامیت کا یہ خواب تو پورا نہ ہوا مگر فکر و فن کی دنیا پر اس کی مکمل حکمرانی صاف نظر آتی ہے۔ فن و ادب کے جو چھوٹے چھوٹے جزیرے کائنات میں بکھرے ہوئے ہیں وہ امتدادِ زمانہ سے ایک دوسرے سے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور عجب نہیں کہ آنے والوں دنوں میں ان کے امتزاج و اشتراک سے فن و ادب کا ایک سمندر وجود میں آئے جس میں ایک ہی لہر اِس کنارے سے اُس کنارے تک پھیلتی محسوس ہو۔"

ڈاکٹر عبدالواسع کی اس پیش گوئی سے قطع نظر یہاں مجھے اس بات کا اظہار بالخصوص کرنا ہے کہ ادب و فن کے جزیروں کو آپس میں ملانے کا بنیادی فریضہ ادیب کی کشادہ نظری ادا کرتی ہے۔ آپ کسی غیر ملکی ادیب کی تحریر کسی نظریاتی تعصب اور جانبداری کے بغیر مطالعہ کریں گے تو یہ تحریر آپ کو روشنی عطا کرے گی لیکن نظر تنگ اور ذہنی تعصب کی زد میں آجاتے تو ساری روشنی معدوم ہو جائے گا اور ادیب کی تحریر خیر سگالی کا فریضہ ادا نہ کر سکے گی، اس صورت میں شاید ادب و فن کا جزیرہ اپنی مخصوص حدود میں ہی سمٹ جائے اور برِّ اعظم کی طرف لپکنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے۔ ڈاکٹر عبدالواسع کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ادب کے کسی نظریے

جناب انوار فیروز کا یہ شعر حاصلِ غزل ہے۔ اس اعتبار سے کہ درج ذیل شعر سے شاعر کا مقصدِ حیات نمایاں اور واضح ہے۔ اور یہ معمولی بات نہیں اس سے اُن کے تشخص کو جلا اور بقا حاصل ہے۔ ؎

وہ آپ مر کے زمانے کو زندہ کر دے گا　　یہ ایک کام تو انوار کر ہی جاتے گا

جناب بشیر سیفی کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کی غزل کے تقریباً تمام اشعار کو پسندیدگی کا مرکز ٹھہراؤں، یہ شعر مرکزِ غزل ہے ؎

اے خدا تیری شراکت کا کسے دعویٰ تھا　　نام دُوئی کا اُچھالا تیری یکتائی نے

جناب آثم فردوسی کی غزل کے کس کس شعر کا ذکر کروں، کیونکہ اختصار کے باوجود تبصرہ طویل ہو گیا ہے مجھے تو اس شعر میں معرفت کا رنگ بکھرا نظر آتا ہے۔ اس شعر میں باطنی کیفیت ہے۔

یوں بھی تری تلاش میں گزری ہے زندگی　　میں خود بھی کھو گیا ہوں تجھے ڈھونڈتا ہوا

حصہ نظم میں جناب رضا ہمدانی، جناب جمیل ملک، جناب سجاد بابر، جناب میر حسین علی امام، جناب سہیل اختر، جناب شوکت مہدی، شمع ظفر مہدی، جناب ظفر مہدی، جناب خاور اعجاز، جناب ساغر مہدی کا کلام عمدہ کاوشوں کا اچھا اظہار ہے۔

محترمہ سیدہ حنا اور جناب پروفیسر حامد سروش کی خدمات میں دعا و سلام۔　　(بنام نسرین سروش)

سجاد بابر۔ جدہ

افضل منہاس کا ایک ایسا نام ہے جس سے میری سماعت اُس وقت آشنا ہوئی جب میں آج ہی کی طرح شعر و ادب کا محض ایک قاری تھا اور فیض، احسان دانش، عدم اور ناصر کاظمی کو اوّلاً اوّلاً پڑھ رہا تھا۔ یہ عہدِ ایوبی کی ابتدا تھی۔

واہ سیمنٹ ورکس کے کلب میں اکثر مشاعرے ہوا کرتے اور یوں معروف شعراء کے ساتھ ساتھ ضلع اٹک اور پنڈی کے شعراء بھی ہمارے لئے اہم ٹھہرے تھے۔ لہٰذا جدید شاعری کے حوالے سے ہم لوگ افضل منہاس سے پہلے متعارف ہوئے اور تشکیب جلالی، ظفر اقبال کو ہم نے بعد میں پڑھا۔

افضل منہاس کے کھرے لہجے اور نئی علامات نے ہم لوگوں کو ایک خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیا۔ سیاسی حبس کے اُس دور میں افضل منہاس کا یوں گرجنا برسنا ؎

کب تک آخر خدائی کتے جائیں گے چلچلاتی ہوئی دھوپ کی دیر ہے
حدتِ آفتابِ جہانتاب سے آج تک موم کے بُت پگھلتے رہے

عجب سرشاری کی کیفیت دے گیا۔ اور ابھی ابھی جب میں یہ شعر لکھ رہا تھا تو مجھے احسان دانش کا دس سال بعد کہا گیا شعر یاد آیا ؎

کل دھوپ کے میلے سے خریدے تھے کھلونے　　جو موم کا پُتلا تھا وہ گھر تک نہیں پہنچا

افضل منہاس کی شاعری اپنے گرد و پیش سے عبارت ہے۔ وہ اشیا کو اور واقعات کو اپنے طور پر دیکھتا اور برتتا ہے۔ اُس کا ردِ عمل خالصتاً شاعرانہ ہے، وہ تلخ بھی ہوتا ہے تو شاعرانہ چابکدستی سے ؎

جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں　　وہ بولنے لگے تو ہمیں پر برس پڑے

اپیا اور حامد بھائی!

آپ نے "ابلاغ" میں افضل منہاس کے لئے صفحات مختص کر کے وہ قرض چکایا ہے جو ادبی برادری پر ایک مدت سے واجب تھا۔　　(بنام سیدہ حنا)

جوگندر پال۔ نئی دہلی

آپ کا نیا "ابلاغ" مل گیا ہے اور ساتھ ہی نئی کہانی کی فرمائش بھی۔ آپ کی کرم فرمائی کے لئے نہایت شکر گزار ہوں۔ آپ جانتی ہیں، نئی تخلیق تو جب ہو پاتے تبھی ہوتی ہے۔ محترمہ سیدہ حنا اور حامد سروش صاحب سے بیگم پال کا اور میرا سلام کہیئے۔ ایک آدھ مہینے میں میرا نیا افسانوی مجموعہ "کھلا" شائع ہو رہا ہے، آتے ہی آپ کو اس کا ایک نسخہ بھیجوں گا۔ بہت دن پہلے آپ کی چٹھی ملتے ہی میں نے آپ کو اپنے افسانچوں کی کتاب "کتھا نگر" بھیجی تھی، آپ نے اس کے ملنے کی اطلاع نہیں بھیجی، اس لئے فکر مند سا ہوں۔ اگر یہ کتاب آپ تک نہ پہنچی ہو تو مطلع کیجئے گا۔ آئندہ ماہ کے اوائل میں "کھلا" کے ساتھ اسے بھی بھیج دوں گا۔ باقی باقی۔　　(بنام نسرین سروش)

اختر ہوشیارپوری۔ راولپنڈی

"ابلاغ" کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ!

ایک تازہ غزل اگلے شمارہ کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے پسندِ خاطر ہوگی۔

آپ نے موجودہ شمارہ میں افضل منہاس کے لئے ایک گوشہ متعین کر کے ایک نہایت ہی خوش آئند قدم اُٹھایا ہے۔ وہ ایک عرصہ سے جدید اسلوب کی غزل کہہ رہے ہیں، مگر ہمارے وطن میں پذیرائی اُنہی لوگوں کے لئے مخصوص ہے جن کی مخصوص لابی ہے۔ اور افضل منہاس صاحب اور دیگر احباب۔ . . . . .

حامد سروش سے سلام کہیئے۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔　　(بنام سیدہ حنا)

اکبر حمیدی۔ اسلام آباد

"ابلاغ" مل گیا ہے۔ شکریہ!

آپ کی محنت اور مسلسل کوششوں کے نتیجے میں "ابلاغ" باقاعدہ بھی ہُوا اور علمی و ادبی حلقوں میں پسندیدہ بھی۔ کسی بھی پرچے کے لئے یہ ایک اعزاز ہوتا ہے کہ لکھنے والے اور پڑھنے والے اس کا انتظار کر رہے ہوں، سو یہ اعزاز اب "ابلاغ" کو بھی حاصل ہے۔ کتاب پر تبصرے اور اشتہار کے لئے شکر گزار ہُوں۔ ایک مضمون بھی میں نے بھیجا تھا برادرم فیروز شاہ کا لکھا ہُوا، اگر شائع ہو جائے تو وہ ایک اچھا مضمون ہے، ذرا آپ توجہ دیجئے گا۔

"ابلاغ" کے لئے میں نے ہمیشہ تازہ غزل بھیجی ہے سو اب کے بھی تازہ غزل ارسال ہے۔ برادرم پروفیسر حامد سروش صاحب سے میرا سلام کہئے۔ خُدا کرے آپ سب خُوش و خرم ہوں۔ (بنام نسرین سروش)

افضل منہاس۔ راولپنڈی

میں نے کل ہی آپ کو خط لکھا اور کل کی ڈاک سے ہی "ابلاغ ۸" کے تازہ شمارے ملے۔ شکریہ۔ پرچہ دیکھا۔ بڑی ہمت ہے آپ کی کہ نامساعد حالات کے باوجود نہ صرف ابلاغ سیر بزہ کو ہی جاری رکھے ہُوئے ہیں بلکہ اُسے خوب سے خُوب تر بھی بنا رہے ہیں۔ پریس تبدیل کر لیں، اس کی طباعت معیاری نہیں۔ بحیثیت مجموعی پرچہ اچھا ہے اور خُوب ہے۔ مبارکباد

(بنام حامد سروش)

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی۔ حیدر آباد (سندھ)

آپ کا خط ملا۔

فضل مِن اللہ صاحب کے بارے میں مجھے علم ہو گیا۔ مجھے بے حد دُکھ ہُوا۔ وہ میرے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ان کے ہاں میرا آنا جانا بھی تھا۔ میرا گھر لاہور میں بھی ہے، والدہ مرحومہ سے جب بھی ملنے جاتا تھا اُن کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا تھا پھر کئی کئی گھنٹے اُن سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ عرصے سے بیمار تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے زیادہ تکلیف محسوس کرتے تھے۔ اب جب بھی اُن کی یاد آتی ہے تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔

آپ نے کتاب پر جو تبصرہ کیا ہے وہ خُوب ہے۔ تنقید کا مطلب میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ خامیوں کی نشاندہی کی جائے۔ تاکہ لکھنے والا آئندہ جب بھی لکھے محتاط ہو کر لکھے۔ میں خُوش ہُوں بلکہ یہ اور بھی اچھا ہوتا اور ہو سکتا ہے کہ مسلسل مضمون لکھا جائے اور ان تمام باتوں کی نشاندہی کی جائے جہاں میں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ ایک طرح سے ثواب کا کام بھی ہو گا۔

جوں ہی "ابلاغ" کا تازہ شمارہ ملا انشاءاللہ اپنی رائے سے مطلع کر دوں گا۔ (بنام سیدہ حنا)

احمد پراچہ۔ کوہاٹ

آج دوپہر کی ڈاک سے "ابلاغ" کا آٹھواں شمارہ مع بہن نسرین کے رقعہ کے ملا۔ اس توجہ اور عنایت کے لئے بہت شکر گزار

ہوں۔ واقعی پرچہ ہر اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ میں تو ابلاغ، کو صوبہ سرحد میں ادب کا سنگِ میل کہوں گا اور ادب کا یہ آٹھواں سنگِ میل محترمہ سیدہ حنا، نسرین سروش اور آپ کے حسنِ انتخاب اور ستھرے معیار کا منہ بولتا ثبوت ہے آپ لوگوں کی محنت، آپ کے مکھے پڑھے کنبہ کی شبانہ روز توجہ رنگ لا رہی ہے۔ صوبہ سرحد جیسے پتھریلے علاقہ سے اشتہارات کے بغیر ہر دو تین ماہ بعد اتنا معیاری ادبی پرچہ نکالنا اور پلے سے ڈاک کا خرچ برداشت کر کے ادبی حلقوں میں اعزازی طور پر پھیلانا بہت بڑا علمی و ادبی جہاد اور زبان اُردو کو عام کرنے کا ایک بہت بڑا کام ہے۔ آپ کے باذوق کنبہ کی داد نہ دینا پرلے درجے کی بخیلی ہوگی۔

، نایاب، کے ایوب نمبر، اشتہار اور خط کی اشاعت کے لئے بے حد شکریہ۔ (بنام حامد سروش)

رب نواز مائل - لورالائی

، ابلاغ، کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ مندرجات ایک سے ایک خوب ہیں۔ یقیناً یہ رسالہ اب اچھی ادبی روایات قائم کر رہا ہے۔ اپنی غزل ، عیاں پھر سے ہو چلے، کی اشاعت کے لئے بھی شکر گزار ہوں۔ مطلع میں پہلا مصرعہ یوں چھپ گیا ہے۔ ، اک درد سے جہاں یہ عیاں پھر سے ہو چلے ، جبکہ مصرعہ حقیقتاً یوں ہے۔

اک درد سے جہاں یہ عیاں پھر سے ہو چلے

آئندہ شمارے کے لئے آپ کی طلبی پر ایک غزل اور تین نظمیں بھیج رہا ہوں۔ نظمیں ایک ہی صفحہ پر آسکتی ہیں جس کا سلسلہ کچھ ایسے ہی رنگ میں آپ نے شروع بھی کیا ہے۔ بہر طور میری طرف سے مواد حاضر ہے۔ (بنام نسرین سروش)

خادر اعجاز - راولپنڈی

، ابلاغ، کا نیا شمارہ موصول ہوا، مشکور ہوں۔ افضل منہاس صاحب کے لئے گوشہ مخصوص کر کے آپ نے ایک گوشہ نشین شخص کو از سرِ نو متعارف کرا دیا ہے۔ اگرچہ بہت کچھ اور لکھا جانا چاہیے تھا لیکن آپ کی کوشش اس کے باوجود قابلِ قدر ہے۔ اُمید ہے آپ لوگ یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔ (بنام نسرین سروش)

محمد احسان الحق - راولپنڈی

آپ کا عنایت کردہ جریدہ ابلاغ، موصول ہو گیا ہے۔ نئے سال کے آغاز پر ابلاغ میں بھی خوشنما اور خوش آہنگ تحریروں کا اضافہ ہوا ہے۔ نظم و نثر کے اس جریدہ میں اُردو ادب کے ہر پہلو کو ہر شمارہ میں بطریق احسن احاطہ کیا جاتا ہے مجھے اُمید ہے کہ جریدہ روز بروز تاریخ علم و ادب میں ایک اہم مقام بنائے گا اور مستقبل میں ایک گراں قدر ادبی دستاویز

کی شکل میں ایک ریفرنس کا کام دے گا۔ جریدہ کی عنایت کا شکریہ۔ (بنام نسرین سروش)

رعنا اقبال۔ کراچی

آپ کی کاوش پرچے کی خوبصورتی کی شکل میں نظر آرہی ہے۔ ابلاغ، کا ہر صفحہ اپنے اندر پڑھنے والوں کے لئے دلچسپیاں سموئے ہوتے ہے۔ (بنام نسرین سروش)

انوار فیروز۔ راولپنڈی

ماشاءاللہ بہت اچھا پرچہ شائع کیا ہے آپ نے۔ ہر چیز بھرپور تھی۔ (بنام حامد سروش)

لطیف کاشمیری۔ مری

"ابلاغ، مجھے برابر مل رہا ہے۔ اس کرم فرمائی کے لئے تہ دل سے ممنون ہوں۔

آپ کا یہ پرچہ سنجیدہ بھی ہے اور معیاری بھی۔ اور اسے وطن عزیز کی ہر لائبریری کی زینت بننا چاہیے۔

گزشتہ ایک شمارے میں آپ کا ایک افسانہ "جزا سزا" پڑھ کر محسوس ہوا جیسے آپ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ایک منجھے ہوئے اور کہنہ مشق کہانی نویس۔ شاید اسی لئے آپ کی بیشتر نظموں میں بھی کہانی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔

آپ کی کتاب "بے جواز" نے بڑا متاثر کیا ہے۔ اس کی بعض نظمیں بڑی خوبصورت ہیں اور اردو کی آزاد نظموں میں اپنی ہیئت اور مواد کے اعتبار سے ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔

آپ کی یہ کتاب ایک کم گو اور کم آمیز دانشور کی شاعرانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کا آئینہ ہے، جس میں عصری صداقتوں اور معاشرتی حقیقتوں کا بھی سراغ ملتا ہے اور شاعر کے جذبے کی گہرائی اور اس کے افکار کی پاکیزگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

خدا آپ کے قلم کو اور بھی قدرت دے اور آپ کو زندگی کے یہ خونچکاں حقائق رقم کرنے کی ہمت دے۔

اپیا اور بھابی کو میرا سلام دیجئے گا اور سلمان میاں کو بہت سا پیار۔ خط لکھنے میں غیر معمولی تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ (بنام حامد سروش)

بیگم عائشہ ضمیر۔ کراچی

ابلاغ کا شمارہ ۵ پہلے سے بھی بہتر ہے۔ آپ سب کی محنت و کوشش عیاں ہے۔ یہ کہنا حق بجانب ہے کہ ابلاغ، روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس ڈائجسٹ کے دور میں روشنی کی کرن ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ

گروہ بندی سے پاک ہے۔ اس کا دامن ہر مکتبِ خیال کے ادبا و شعرا کے لئے کھلا ہے۔ ورنہ تنگ نظری اور دھڑے بندی بہت سے اچھے ادیبوں شاعروں کو کھا گئی ہے اور رسائل کو بھی۔ آپ کا اداریہ "خواتین کی شاعری" خوب زوردار ہے۔ آپ نے بڑی کھری اور صاف بات لکھی ہے جو آپ کی جرأت کی آئینہ دار ہے۔ آخری سطروں کو پڑھ کر میں بہت ہنسی، وجہ۔ جب میں نے لکھنا لکھانا شروع کیا تو ابتدا شاعری اور بچوں کی کہانیاں لکھ کر کی۔ یہاں تک کہ ایک چھوٹی سی بیاض تیار ہو گئی لیکن ہوتا یہ تھا کہ چار یا پانچ شعر تو آمد پھر آورد ہی آورد۔ یوں وہ پوری بیاض چوں چوں کا مربہ بن گئی۔ جب میرا شعور پختہ ہوا، تحریر کی خوبی و خامی کچھ سمجھ میں آئی تو میں نے محسوس کیا شاعری میرا میدان نہیں۔ لہٰذا ایک دن وہ لال کتاب (جو واقعی لال کتاب تھی) آنکھ بند کر کے چاک کر دی۔ یوں میں شرمندگی سے بچ گئی۔ اس لئے آپ کا یہ کہنا کہ اگر واقعی کوئی شاعری کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اس میدان میں نہ آئے بہترین مشورہ ہے۔

ابلاغ کا شمارہ ۵ فضل من اللہ صاحب مرحوم کا ایک دلچسپ و خیال آفریں مکتوب شائع ہوا تھا جس کی تعریف میں نے لکھی تھی۔ مگر افسوس وہ اب دنیا میں نہیں۔ بلاشبہ یہ ادب کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ نمبر ۸ میں بھی موصوف کا ایک طویل دلچسپ و معلوماتی اور بہت ہی مفید باتیں کارآمد مشورے والا خط موجود ہے جس میں اردو کا حلیہ بگاڑنے پر شکایت لکھی ہے۔ افسانوں میں آثم میرزا کا "قند"، ہندی کہانی بہت اچھی تھی۔ ڈاکٹر پرین عظیم کا "چودہ اگست" بہترین افسانہ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا انشائیہ "رشتہ دار" معاشرے پر بھرپور طنز ہے۔ حصہ نظم کافی زوردار ہے، ماہیے بہت اچھے ہیں۔ افضل منہاس کی غزلیں بہت خوبصورت ہیں۔ غزل میں وزیر آغا، اختر ہوشیارپوری، ایوب صابر، سہیل اختر، رب نواز، انوار فیروز، بشیر سیفی، شمع ظفر مہدی، آثم فردوسی کی غزلیں اچھی ہیں۔ بزمِ احباب پُر رونق ہے۔ محترم افضل منہاس پر اچھے اور معلوماتی مضامین ہیں جن کو پڑھ کر منہاس صاحب کی شخصیت سے کماحقہٗ آگاہی ہوئی۔

(بنام سیدہ حنا)

جوگندر پال۔ نئی دہلی (انڈیا)

گزشتہ دنوں وزیر آغا، اور انور سدید اجنتا ایلورا دیکھنے کے لئے یہاں آئے ہوئے تھے اور ظفر پیامی اور میں ان کے ساتھ اورنگ آباد دکن گئے ہوئے تھے۔ لوٹنے پر آپ کا پوسٹ کارڈ ملا، نہیں، ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ میں نے "ابلاغ" ملتے ہی آپ کو چٹھی لکھی تھی، لگتا ہے میرا وہ خط آپ تک نہیں پہنچ پایا۔ لیجیے، آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنی یہ نئی کہانی "انتم پاٹھ" "ابلاغ" کے لئے حاضر کر رہا ہوں۔ یہ کہانی انہی دنوں یہاں کے ماہنامہ "آجکل" میں شائع ہوئی ہے۔ آپ بھی اسے اپنے قارئین کے لئے چھاپ لیجیے۔ اسے لکھ کر میں بہت اداس رہا تھا۔ آپ کو بھلی لگے تو دعاؤں میں یاد رکھیے۔ اس کہانی میں پنجابی لہجہ اور بعض پنجابی جملوں کا استعمال ناگزیر ہے، تاہم میں نے انہیں کچھ اس طرح بٹھانے کا جتن کیا ہے کہ غیر پنجابی

قارئین بھی مطلب کو پالیں۔ حامد سروش اور نسرین سروش سے سلام کہتے۔ باقی باقی۔ نیک خواہشات!

(بنام سیدہ حنا)

آثم فردوسی۔ لاہور

پرچہ میں جس طرح آپ نے مضامین کی ترتیب رکھی ہے مجھے نہایت ہی پسند آئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ انتخاب مضامین و نظم و نثر قابلِ ستائش ہیں۔ اُردو ادب کے نئے اور پُرانے چہروں کو آپ نے انتہائی خُوبصورتی کے ساتھ یکجا کیا ہے۔ یہ اس کی سب سے بڑی خُوبی سمجھوں گا۔

محترمہ سیدہ حنا کا اداریہ "خواتین کی شاعری" بہت پسند آیا۔ ہمارے ملک میں بہت بڑا المیہ نہ جانے کب سے سایہ فگن ہے۔ اور کچھ بڑے نام (جن کو میں ادب کے بے ادب کالے دیو کہوں گا) مسلط ہیں جو شاید یہ سمجھ کر بات کہہ دیتے اور لکھ دیتے ہیں کہ شاید باقی لکھنے والے اندھے، گونگے اور بہرے ہیں۔ اور دراصل انہیں اپنے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو آپ ادبی حلقوں کا فرعون کہہ سکتے ہیں۔ خدا انہیں سمجھے۔

افضل منہاس صاحب کے متعلق احباب کے مضامین نے بہت مزہ دیا ہے۔ حصہ نظم کافی جاندار ہے اور خُوبصورت بھی۔ ڈاکٹر صاحب کا انشائیہ ماشاءاللہ بہت ہی خُوب ہے۔ افسانے ـــ اور اچھے کبھی کبھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اب کے یکسی نہیں ہے۔ غزلیات کا حصہ خاصا جاندار ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اختر ہوشیارپوری، اکبر حمیدی، سہیل اختر، انوار فیروز وغیرہ خاصے نظر آتے ہیں۔ خُوبصورت اشعار کی کمی نہیں محسوس ہوتی۔

(بنام نسرین سروش)

حکیم محمد سعید۔ کراچی

"ابلاغ" کا آٹھواں شمارہ میں نے دیکھا۔ یہ ایک خالص ادبی رسالہ ہے جس میں عصری ادب کو پیش کرنے کی حقیقت پسندانہ کوشش کی گئی ہے۔ زیرِ نظر شمارہ میں تنقید، شاعری اور افسانہ ہر صنف کو سلیقہ سے شائع کیا گیا ہے۔ تخلیقات کے انتخاب میں خوش ذوقی کے مظاہرہ سے انکار ممکن نہیں۔ رسالہ کا ابتدائی حصہ ملک کے معروف شاعر جناب افضل منہاس کے لئے مخصوص ہے جس میں افضل منہاس صاحب کی شاعری کے بارے میں تین مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے افضل منہاس صاحب کے فن اور ان کی انفرادیت کے خدوخال اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ مختلف شعراء اور ادباء سے متعلق اس طرح کے گوشے مخصوص کرنا ایک اچھی روایت ہے اور زیرِ نظر رسالہ، میں اس روایت کو بطرزِ احسن برتا گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آئندہ بھی یہ رسالہ اپنی خالص ادبی حیثیت کو برقرار رکھے گا اور ادبی سیاست سے اپنا دامن بچائے رکھے گا۔

(بنام نسرین سروش)

بلمراج کومل - نئی دہلی (انڈیا)

آپ کا خط ملا۔ اور اس سے پہلے "ابلاغ" کا تازہ شمارہ بھی مل گیا تھا۔ ممنون ہوں۔ "ابلاغ" حسنِ ترتیب کا نمونہ بنتا جا رہا ہے۔ ایک تازہ نظم پیش کر رہا ہوں۔ (بنام سیدہ حنا)

شاہد عباس - راولپنڈی

شمارہ نمبر ۸ میں پاک و ہند کے نامور شاعر جناب افضل منہاس پر ایک مخصوص گوشہ مختص کیا گیا ہے جس کے لئے آپ کو ہدیۂ تبریک۔ کیونکہ جناب افضل منہاس نصف صدی سے اپنی ہمہ گیر شاعری میں عالمِ انسانیت کے دُکھ سمونے میں مصروف ہیں۔ اور اپنے منفرد انداز فکر سے جملہ اصنافِ شاعری کو پُر بہار کئے ہوئے ہیں۔ آج جبکہ وہ اپنی فنی صلاحیتوں کے بامِ عروج پر متمکن ہیں اور خصوصاً صنفِ غزل کو امکانات کی نئی دُنیاؤں سے متعارف کرا رہے ہیں۔ یہ گوشہ ایک تاریخی جدّ و جہدِ ادبی کی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مجھے یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ ابلاغ کی ادبی پالیسی گروہ بندیوں سے مبرّا اور "حق بہ حق دار رسید" کے آفاقی اُصول سے عبارت ہے۔

بلاشبہ جناب افضل منہاس کی ادبی خدمات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ کاش دوسرے موقر جرائد بھی ابلاغ کی تقلید کر سکیں۔

شمارہ نمبر ۸ کے دیگر مندرجات بھی زندہ ادب کے شہ پارے ہیں۔ آپ نے نظم و نثر کے انتخاب میں سو فیصد کامیابی حاصل کی ہے۔ دُعا ہے کہ ابلاغ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔ (بنام حامد سروش)

آثم میرزا - سیالکوٹ

ابھی آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے، اور جواب لکھ رہا ہوں۔ ابلاغ کا تازہ شمارہ وقت پر ہی مل گیا تھا۔ لاہور سے آثم فردوسی نے اطلاع دی تھی کہ انہوں نے بھی پرچہ حاصل کر لیا ہے۔ پرچہ کے اداریہ کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔ سچائی کے اظہار کے لئے ابلاغ نے جس جرأت کا ثبوت دیا ہے وہ ہم سب کے لئے باعثِ افتخار ہے (بنام حامد سروش)

ساغر مشہدی - کبیر والہ

ابلاغ، واقعی فصاحت و بلاغت کا مرقع ہے۔ اچھے افسانوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ حصۂ نظم بھی خوب ہے اللہ کرے اور ترقی کرے۔ آمین (بنام حامد سروش)

ساحل احمد۔ الٰہ آباد (انڈیا)

سلام و نیاز۔ پرخلوص تحفہ بنام ابلاغ (۸ جنوری ۹۸۹ء) ملا۔ سراپا سپاس ہوں۔
افضل منہاس کے گوشہ کی شمولیت نے پرچے کو وقیع بنا دیا ہے۔ افضل منہاس پر لکھنا اور پڑھنا دونوں ضروری ہیں۔ رشید امجد کا وہ پیش لفظ جو واقعی قیمتی تھا۔ آپ نے اُسے دوبارہ شائع کر کے وقت کی گرد صاف کر دی ہے افضل منہاس کی غزلوں میں کرب کی جو دیرپا خوشبو ملوث ہے وہ ہمارے اذہان کو ہی نہیں فکر کو بھی متاثر کرتی ہے

سانسوں کا بازار سجا ہے، بھیڑ لگی ہے لوگوں کی
اک جینے کی خاطر یارو کیسے کیسے حیلے ہیں

خشک سالی نے مری آنکھوں کی رونق چھین لی
آندھیاں چلتی رہیں بادل مگر برسا نہیں

بے نوا اسیروں کی بات کون سنتا ہے
اک طرف خموشی تھی، اک طرف خدائی تھی

انسانیت کا نوحہ لکھا ہے تمام عمر
اس سے زیادہ کوئی تعارف نہیں مرا

اب رہا یہ شمارہ، وہ آپ کی محنت کا آئینہ ہے۔ (بنام نسرین سروش)

سہیل اختر۔ بہاولپور

ابلاغ کا آٹھواں شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے میں یوں تو سبھی نگارشات خوب ہیں، لیکن افضل منہاس، اختر ہوشیارپوری، اور خاور اعجاز کی غزلیں، شاہین اور آپ کی نظمیں اور آتم میرزا اور ڈاکٹر پروین عظیم کے افسانے بے حد دلکش اور اثر انگیز تھے۔ تاہم اس شمارے کی جان فضل" من اللہ مرحوم کا تنقیدی خط تھا۔ اللہ تعالیٰ فضل من اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

بزمِ جہاں سے دوستو کتنے عظیم لوگ
مثلِ شرار سوئے عدم رقص کر گئے

(بنام حامد سروش)

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی۔ حیدر آباد

آپ کا اداریہ وقت کا اہم تقاضا ہے۔ اس کی دونوں ہی صورتیں ہیں۔ اس میں ناشران کا بھی اہم کردار ہے۔ یہ

بھی حقیقت ہے کہ عورتوں کی ایک تعداد نہیں لکھ سکتی اور شاعرہ یا مصنف بن جانے کا خواب دیکھنا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ بعض ضرورت مند حضرات اپنی معاشی ضروریات کے پیش نظر لکھ کر دیتے ہیں۔ بعض لکھنے والے تو اتنے استاد ہیں کہ وہ کرائے کی چیزوں میں کوشش کر کے اپنا مخصوص رنگ شامل نہیں ہونے دیتے، اور ناشران تجارتی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بزنس کرتے ہیں۔ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ خواتین میں لکھنے والیاں ہی نہیں ہیں۔ قرۃ العین، عصمت، ممتاز شیریں، اور بہت سی خواتین صفِ اول کی لکھنے والی ہیں۔ دراصل میں آپ کی اس بات سے کلی اتفاق کرتا ہوں کہ لکھنے کے لئے مرد یا عورت کی جنس اتنی اہم نہیں ہے۔ کرائے پر لکھنے لکھانے کا کاروبار مرد حضرات بھی کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ ہے تو ایک تیسرے درجے کا کام لیکن بزنس کے لحاظ سے اہم ہے وہی دہانوی۔ میں ایسے کئی اچھے اور سنجیدہ لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے محض معاوضے کی خاطر دہی وہانوی بننے پر رضامندی ظاہر کی۔ سستے رومانی، جنسی اور فلمی ٹائپ ناولیں آج بھی کبھی کبھی فرضی نام سے کبھی کسی خاتون کے نام چھپ رہی ہیں۔ یہ معاشرے کو تباہ کرنے کا سستا طریقہ تو ہے لیکن دوسری طرف اس کا دوسرا رُخ بھی ہے۔ اس کی ایک سے زیادہ وجوہات ہیں۔

میں سمجھتا ہوں معیاری ادب کے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پر ہی توجہ دی جانی چاہیے۔ عورت/مرد کی اس میں کوئی قید نہیں۔ احساسات کہیں تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر مختلف ہو سکتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے لیکن اس بات کا معیار پر اثر نہیں پڑتا۔

آپ نے فضلؒ من اللہ مرحوم کا خط چھاپا ہے۔ مرحوم میرے بڑے کرم فرما اور مربی تھے۔ خدا نے توفیق دی تو ان کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھوں گا۔

مرحوم نے ہمیشہ علمی ادبی بحثوں میں حصہ لیا اور بڑے معرکے کی باتیں کیں۔ اس خط میں بھی انہوں نے زبان کے حوالے سے جو باتیں کی ہیں ان کی اہمیت بے حد ہے۔ ان میں تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق کا جذبہ بھی تھا۔

افسانے اچھے ہیں۔ خاص طور سے ہندی افسانے کا ترجمہ موثر انداز میں بظاہر یہ ہندو تہذیب کا ایک رُخ ہے لیکن اصل میں سماجی مسئلہ ہے۔ منافقت کا مسئلہ ہے۔ اور اس کا وجود کسی بھی معاشرے میں ہو سکتا ہے۔۔۔

افضل جھانسی کے بارے میں مضامین نہایت معلوماتی ہیں اور ان کے فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ایسے لوگ جو اندر سے کھوکھلے ہیں بالکل کھوکھلے، سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے اپنے اوپر ترقی پسندی کا خول چڑھا لیتے ہیں اور لولی (LOVELY) سکینہ! بائی گاڈ آج کل فارن سروس کی طرح، ترقی پسندی بھی ایک فیشن بن گیا ہے

اشرف حسین احمد کا خیال انگیز ناول

ترکہ

پل پل بدلتی ہوئی زندگی کی کہانی ——— زندہ حقیقتوں کا ترجمان

کی اسیری قبول نہیں کی اور فیض و استفادہ کا عمل اختیار کیا تو امتزاج و اشتراک کو فوقیت دی۔ چنانچہ ان کی تنقید میں نظریہ سازی کا زاویہ حالی کی تنقید سے پھوٹتا ہے اس لئے انہوں نے عقلی طریق اختیار کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی ثقافتی اور تہذیبی روش نے ان کے ہاں دو صورتیں پیدا کیں۔ اوّلاً انہوں نے عملی تنقید میں ماضی کے ادب کو اہمیت دی، سوانح کو موضوع بنایا تو شوکتِ پارینہ کے نقوش میں دلچسپی لی، ثانیاً تنقید ایک ایسے رومانی اسلوب میں لکھی کہ ان کے استخراجات ان کے رومانی تجربے نظر آنے لگے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جاتے کہ اُن کی تنقید میں حالی اور آزاد کے دھارے آپس میں مل گئے ہیں تو یہ بالکل دُرست ہو گا۔

ڈاکٹر عبدالواسع کا بنیادی موضوع سوانح نگاری ہے۔ انہوں نے اس فن کے نکات و معارف کا تعین بھی کیا ہے اور سوانح نگاروں کے ادبی کارناموں پر تنقید کا حق بھی ادا کیا ہے۔ ان کی کتاب "فنِ سوانح نگاری" اور "بہار میں اُردو سوانح نگاری کا آغاز و ارتقاء" کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع میں ڈوبے ہی نہیں اُبھرے بھی ہیں اور اس عمل میں اپنے ساتھ جو صحائف لاتے ان کے اثرات ان کی پوری ادبی تنقید میں موجود ہیں۔ چنانچہ وہ موضوع کو محض نقاد کی نظر سے دیکھ کر اس کی جرّاحی یا تفتیش نہیں کرتے بلکہ حالی، شبلی، باسویل یا لٹن سٹریچی کی طرح پہلے موضوع سے محبت پیدا کرتے ہیں اور پھر اسے سوانحی انداز میں یوں پیش کرتے ہیں کہ موضوع کا ماضی اس کے حال سے وابستہ ہو جاتا ہے اور موضوع خود ایک شخصیت کا رُوپ اختیار کر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے گراں قدر مقالہ "ولی کا تصوّف" میں انہوں نے ولی کے سوانح ہی سے استفادہ نہیں کیا بلکہ تصوّف کی سوانح کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے اور اس عمل میں جب وہ اجمالی طور پر سعدی، حافظ، رومی، جامی، امیر خسرو، کا ذکر کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس موضوع کے سمندروں کو آپس میں ملا کر ایک بڑا قلزم تشکیل دے رہے ہیں۔ ولی دکنی بھی اس قلزم ہی کا ایک قطرہ ہے۔ اور اس کا وحدت الوجودی رویّہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس قلزم میں ہی ضم ہونے کے لئے بے قرار ہے۔

مقالہ "انیس کی جذبات نگاری" میں بھی پس منظر کو منظر کے ساتھ اور فنی نظریے کو تخلیقی عمل کے دائرے میں رکھ کر دیکھنے کا انداز موجود ہے۔ انہوں نے مرثیہ کی سوانح سے بھی استفادہ کیا ہے اور میر انیس کی حیات سے بھی مدد لی ہے۔ ڈاکٹر عبدالواسع کی منفرد خوبی یہ ہے کہ وہ طویل اقتباسات سے گریز کرتے ہیں لیکن اپنے موضوع کی سوانحی کمتوں کو کسی موقع پر بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اس کی ایک نمائندہ صورت ہمیں ان کے "مسجد قرطبہ" والے مضمون میں ملتی ہے۔ "مسدس حالی کی قدر و قیمت" کے تار و پود میں بھی یہ جوہر استعمال میں لایا گیا ہے۔ اور یہی عمل لسانی موضوعات پر لکھے گئے مقالات میں ملتا ہے۔

نتیجے کی طرف آئیں تو میں عرض کروں گا کہ ڈاکٹر عبدالواسع نے متنوع موضوعات پر کام کیا ہے لیکن اپنی ادبی شخصیت کو اس تنوع میں بکھرنے نہیں دیا۔ وہ اپنے مضامین کے پس منظر میں ایک ایسے نقاد کی صورت میں اُبھرتے ہیں جو جغرافیائی،

ہماری مطبوعات

بوئے گل (ناول ــــ سلمیٰ یاسمین نجمی)

صفحات ۴۲۲ ــــ قیمت -/۳۶ روپے

"ہمارے ہاں پاکیزہ ادب ایک قومی ضرورت ہے۔ سلمیٰ نے ناول لکھ کر خیر کو تقویت پہنچائی ہے۔ اس لیے کہہ کہے بغیر خیر کے علمبرداروں کا حق ادا کر دیا ہے۔"

(اسعد گیلانی ــــ ماہنامہ سیارہ، لاہور)

"اتنا خوبصورت ناول لکھ کر آپ نے ذہن و دل مسحور کر لیے ہیں۔"

(آصفہ توصیف عثمانی)

جھوٹی کہانیاں (افسانے ــــ سیدہ جنا) صفحات: ۲۸۸ ــــ قیمت: -/۴۰ روپے

"اس کے افسانوں میں جیتے جاگتے انسانی کردار ہیں جو شادی دنیا کی بازیافت کے لیے اپنی دریافت کے عمل سے گزر رہے ہیں۔" (لطیف ساحل)

معنی دیریاب (غزلیات ــــ زکی زاکانی) صفحات ۲۸۸ ــــ قیمت: -/۴۰ روپے

"ان کی شاعری میں اقبال کی روح موجود ہے۔ ان کے اسلوب میں غالب کی پنجہ کاری نظر آتی ہے چنانچہ جذبہ جب لفظوں کی بُنت میں شامل ہوتا ہے تو ہمہ رنگ جلوہ پیدا کر دیتا ہے۔" (ڈاکٹر انور سدید)

بے جواز - غزلیات ــــ سید حامد سروش ــــ قیمت: -/۴۰ روپے

پاک ڈائجسٹ لاہور - عبدالکریم ثمر نمبر قیمت: -/۴۰

پاک ڈائجسٹ پبلیکیشنز، ۲۷/بی، وحدت کالونی۔ لاہور ۱۶

QUARTERLY "IBLAGH" Peshawer. Regd. P. NO, 265.

حامد سروش کا مجموعۂ کلام

بے جواز

حامد سروش کی شاعری کی یہ خوبی ہے کہ ایک خاص تمثیل کی آئینہ داری کے باوصف